مضراب و رباب

اقبال عظیم

دو کتابیں

اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب نہیں ہے، دو کتابیں ہیں یعنی میری غزلوں کے پہلے مجموعے "مضراب" کا دوسرا ایڈیشن اور میری تازہ غزلوں کا مجموعہ "رباب"۔ یہ بات آپ کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اس لئے وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ "مضراب" کے دوسرے ایڈیشن کا تقاضا اب اتنی شدت اختیار کر چکا تھا کہ میں نفی میں جواب دیتے ہوئے شرم محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف یہ خیال بھی تھا کہ میں اپنے نعتیہ مجموعے "قابَ قوسین" میں غزلوں کے دوسرے مجموعے کا اعلان کر چکا ہوں، اس وعدے کا پاس بھی لازمی تھا لیکن ظاہر ہے کہ بے پناہ گرانی کے اِس دَور میں بہ یک وقت دو کتابوں کی اشاعت کم از کم میرے بس کی بات نہیں تھی اِس لئے حل یہ نکالا کہ دونوں تقاضے ایک ہی کتاب سے پورے کر دیے جائیں، چنانچہ دونوں کتابوں کا مجموعہ "مضراب و رباب" حاضرِ خدمت ہے۔ اعلان کے مطابق نئے مجموعے کا نام "لب کشا" ہونا چاہیئے تھا لیکن "مضراب" کی مناسبت سے صوتی آہنگ برقرار رکھنے کے لئے "لب کشا" کے بجائے "رباب" تجویز ہوا جو پسند خاطر ہونا چاہیئے۔
جی چاہتا تھا کہ تازہ غزلیں پہلے اور مضراب کی غزلیں بعد میں شاملِ کتاب کی جائیں لیکن کچھ کتاب کے نئے نام کے خیال سے اور سنینِ اشاعت کے پیشِ نظر یہ بات مناسب نہیں تھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں سمجھا جانا چاہیئے کہ میں تازہ غزلوں کو ثانوی حیثیت

دے رہا ہوں بلکہ میں یہی چاہوں گا کہ آپ کتاب کا مطالعہ "رباب" سے شروع کریں۔

"مضراب" کی دوسری اشاعت سے ایک فائدہ اور بھی ہوا اور وہ یہ کہ پہلی اشاعت میں کتابت کی جو غلطیاں نظر انداز ہو گئی تھیں وہ اب دُرست کر دی گئیں اور کچھ غزلوں کے بعض اشعار جو مجھے اُس وقت یاد نہیں آئے تھے اب شاملِ کتاب ہو گئے۔ تاہم معذرت کے ساتھ مجھے یہ اعتراف بھی کرنا ہے کہ کتاب کے حجم کو قابو میں رکھنے کے لئے مضراب کی آخری ۳، ۴ غزلیں ترک کر دی گئی ہیں اور بعض غزلوں سے ایک ایک شعر بھی کم کر دیا گیا ہے جبکہ حصۂ نثر بھی مختصر تر ہے۔ حمد اور نعت دونوں تازہ ہیں۔

میں جناب محمد یٰسین مرادآبادی کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اس کتاب کی طباعت کے سلسلے میں قولاً و فعلاً رضاکارانہ طور پر میرا بخوبی ہاتھ بٹایا۔ محمد زبیر صاحب کا شُکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے ہر قدم پر مستعدی اور خلوص کے ساتھ تعاون فرمایا۔ جناب مشتاق احمد چاندنا کا احسان مند ہوں کہ ان کی مشاورت اور اعانت میرے لئے بڑا سہارا ثابت ہوئی اور برادرم سید محمود رضوی اور جناب فہیم الزماں صاحب کا مِنّت گزار ہوں کہ نقلِ مسودات میں اُنھوں نے مدد فرمائی۔ عزیزم احسان کاکوروی نے خاصی تعداد میں کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح کی جس کے لئے تہِ دل سے دعائے خیر اور اعترافِ تعاون کی غرض سے ان کا ایک شعر بھی شاملِ کتاب:

سیرتوں کے چہروں پر صورتوں کے پردے ہیں
دُور سے نہیں ہوتا آدمی کا اندازہ

اقبال عظیم

منزل بہ منزل

کراچی میں میرے قیام کو اب گیارہ سال ہو چکے اور یہ مدت میں نے گھر میں بیٹھ کر نہیں گزاری اس لئے اب اس قسم کا تعارف ضروری نہیں رہا جیسا کہ مضراب کی اشاعت کے وقت محسوس ہوا تھا۔ تاہم یقینی نہیں کہ اس کتاب کا ہر قاری مجھ سے واقف اور میرے حالات سے باخبر ہو اس لئے دستورِ وقت کے مطابق عرض کرتا ہوں کہ میرا نام تو کتاب کی جلد ہی پر نظر آجائے گا، چہرہ شناسی کے لئے کتاب میں ایک حالیہ تصویر موجود ہے اور اگر مزاج دانی مقصود ہو تو ابتدائی چند غزلوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

میری تاریخِ پیدائش ۸/جولائی ۱۹۱۳ء، جائے پیدائش میرٹھ اور آبائی وطن قصبہ انبیٹھ ضلع سہارن پور ہے جسے پہلی اور آخری دفعہ میں نے والدین کے انتقال کے بہت بعد دیکھا اور وہ بھی یوں کہ شادی کفو میں ہوئی۔ ورنہ یہ سعادت بھی کبھی حاصل نہ ہوتی۔ عمر کا وہ حصہ لکھنؤ میں گذارا جس میں شعور اپنی راہیں متعین کرتا ہے اور قلب و دماغ تربیت و تہذیب کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اس لئے لکھنؤ سے وہی تعلقِ خاطر ہے جو کسی کو مادرِ وطن سے ہونا چاہیئے۔

میں نے ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ اسکول اناؤ سے۔ انٹر کا ۱۹۳۲ء میں کرسچین کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کا امتحان ۱۹۳۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اور اردو میں ایم۔ اے، آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں پاس کیا۔ بعد ازاں تحقیقی کام کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک رہا۔ تربیتِ معلمی ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کی۔ ہندی کا امتحان ہندوستان میں اور بنگلا کا امتحان سابق مشرقی پاکستان میں پاس کیا۔

عربی انٹر تک نصاب میں شامل رہی اور فارسی کا ایک ایک پرچہ بی اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں لازمی تھا۔

گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں عارضی ملازمت کے بعد معلّم کی حیثیت سے میری سرکاری ملازمت کا سلسلہ مارچ ۱۹۳۹ء سے شروع ہوا اور جولائی ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں ڈھاکے چلا گیا۔ جہاں سرکاری ڈگری کالجوں میں تقریباً بیس سال تک پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس دورِ ملازمت کے آخری پانچ سال میں نے صوبائی سکریٹریٹ میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے گذارے اور ۱۹ ضلعوں کے لئے تعلیم و ادبیات پر ابواب لکھنے کی خدمات انجام دیں۔ فروری ۱۹۷۰ء میں پنشن لے کر بھائی صاحب کے پاس لاہور آ گیا اور اب جولائی ۱۹۷۰ء سے بچّوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہوں۔

تصنیف و تالیف کی صورت یہ ہے کہ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "مضراب" ۱۹۶۵ء میں اور نعتوں کا مجموعہ "قابَ قوسین" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور غزلیات کا دوسرا مجموعہ "مضراب و رباب" آپ کے سامنے ہے۔ نثر میں ایک ضخیم کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" ہے جو مشرقی پاکستان سے متعلق اردو زبان و ادب کا دو سو سالہ تذکرہ ہے اور ایک کتاب "سات ستارے" کے نام سے ہے جس میں پاکستان کے سات معماروں کا احوال ہے۔ علاوہ ازیں بنگلا ترقیاتی بورڈ کی جانب سے "اردو بنگلا لغت" کا حصۂ اردو میری ادارت میں شائع ہوا اور وہیں میں نے حکیم ناطق لکھنوی کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا۔

اپنی ذات سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کر دینے کے بعد ضروری سمجھتا ہوں کہ آغازِ شعر گوئی سے اس وقت تک کے سفرِ شاعری کی رُوداد مختصراً پیشِ خدمت کر دوں اس لئے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم بھائی بہنوں کو جن بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا اُن میں ایک نعمت یہ بھی ہے کہ ہم نے ایک دینی و علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ادبی ذوق ہمیں ترکے میں میسّر آیا۔ دادا صاحب قبلہ حضرت سیّد فضل عظیم فضلؔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ والد صاحب قبلہ حضرت سیّد مقبول عظیم عرشؔ اردو کے مسلّم الثبوت غزل گو شاعر تھے اور نانا صاحب قبلہ حضرت ادیبؔ میرٹھی بھی صاحبِ دیوان شاعر اور حضرت بیاںؔ و یزدانیؔ میرٹھی کے مشہور تلامذہ میں سے ایک تھے۔ دادا صاحب قبلہ کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا البتہ

والد صاحب قبلہ کو مشاعروں میں پڑھتے سُنا اور اُن کی بیاضیں بھی بھائی صاحب کے پاس دیکھیں۔ کِلک کے قلم اور سیاہ رُوشنائی سے لکھا ہوا نانا صاحب قبلہ کا خود نوشت دیوان بھی اب تک محفوظ ہے۔ اور اس کی تحریر اتنی خوبصورت ہے کہ اس پر مطبوعہ کتاب کا گمان ہوتا ہے۔ نانا صاحب کے قلم دان میں پچاس پچاس برس پرانے کلک کے قلم میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اگر چہ یہ تذکرہ "پدرم سلطاں بود" والی بات ہے۔ تاہم مجھے اس نسبت پر ناز ہے اور اسی قدر فخر اِس امر پر ہے کہ میری بساط کے مطابق قدرت نے مجھے اِس خاندانی روایت کے تحفظ کی توفیق عطا فرمائی۔

آج اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ فنِ شعر گوئی میں میری ذہنی تربیت کا آغاز اُسی وقت ہو چکا تھا جب میں گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ میں درجۂ ہشتم کا طالبِ علم تھا۔ یہ وہی ضلع اناؤ ہے جس نے دنیائے شعر و ادب کو مولانا حسرت موہانی، سیدآلِ رضا اور بابو جگت موہن رواں جیسے اکابرِ سخن عطا فرمائے اور جس کی آغوش میں جسٹس محمد رضا کے اُن فرزندوں نے پرورش پائی جو آگے چل کر اپنے اپنے شعبۂ حیات میں قد آور شخصیتوں کے مالک ہوئے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب والد صاحب اپنی سرکاری ملازمت کی آخری منزلوں سے گزر رہے تھے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی وہاں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مامور تھے۔ بابو جگت موہن رواں زندہ تھے۔ مولانا حسرت موہانی و سیدآلِ رضا کی غزلیں فضا میں گونج رہی تھیں اور شہر میں فیض آباد، جونپور اور بنارس کے کچھ پختہ مشق شعرا بھی قیام پذیر تھے۔ آئے دن شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ ہمارے اسکول کی جانب سے بھی سال میں ایک بار حضرت اثر لکھنوی کی زیرِ صدارت ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر منعقد ہوتا تھا جس میں مذکور حضرات کے علاوہ لکھنؤ اور کانپور کے شعراء کرام بھی شرکت فرماتے تھے۔ ان مشاعروں کے لئے سرگرم رضاکار کی حیثیت سے خدمات انجام دینا، مشاعروں سے پسندیدہ غزلیں نقل کر کے لانا اور انہیں ازبر کر کے احباب کو ترنم سے سُنانا اُس زمانے میں میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اسکول میں بیت بازی کے مقابلوں کا بھی زور تھا جس کے لئے سیکڑوں اشعار یاد کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی اور سیدآلِ رضا کی بے شمار غزلیں مجھے خصوصیت سے یاد تھیں۔

حضرت اثر لکھنوی، بابو جگت موہن رواں، حضرت رضی جونپوری، حضرت فرخ بنارسی اور حضرت ثاقب بریلوی والدصاحب کے خاص دوستوں میں تھے۔ اِن حضرات کو گھر پر اکثر مہمان ہوتے دیکھا اور شعر پڑھتے سُنا۔ حضرت ثاقب کان پوری اور حضرت ذرّہ کان پوری بھی وہاں اُس زمانے میں مقبول تھے۔

والدصاحب تہرانا دُسے تبدیل ہو کر تحصیل حسن گنج پہنچے تو قصبہ "موہان" وہاں سے بہت قریب تھا۔ جب کبھی معلوم ہوتا کہ مولانا حسرت موہانی آئے ہوئے ہیں تو والدصاحب کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضری کی سعادت ضرور حاصل ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ والدصاحب موہان سے واپس آتے ہوئے مولانا حسرت کو بھی حسن گنج لے آئے جہاں اُنھوں نے کئی کئی گھنٹے قیام فرمایا اور والدصاحب کے اصرار کے باوجود یکّہ کے بجائے پیدل ہی موہان واپس گئے حالانکہ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔

اس سبق آموز ادبی فضا میں زندگی کے کچھ بیش قیمت دن گذارنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ چلا گیا، جہاں بھائی صاحب پہلے ہی سے موجود تھے اور چند سال بعد والدصاحب نے بھی پنشن لے کر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہمارے گھر کے بائیں جانب کوئی ایک سو قدم کے فاصلے پر حضرت نیاز فتح پوری کا دولت کدہ اور ماہ نامہ نگار کا دفتر تھا اور دائیں جانب تقریباً اُسی فاصلے پر حضرت عبدالباری آسی اُلدنی کا مکان تھا جبکہ تیسری جانب کوئی ایک فرلانگ دُور حضرت قدیر لکھنوی کا قیام تھا۔ ان حضرات سے والدصاحب کے دوستانہ تعلقات ہو گئے اور بعدازاں نواب جعفر علی خاں اثر بھی پنشن لے کر لکھنؤ آ گئے۔

رفتہ رفتہ جناب بہزاد لکھنوی، شاہ بیدم وارثی، جناب وصل بلگرامی اور جناب سراج لکھنوی بھی والدصاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے اور مقامی مشاعروں میں والدصاحب کی شرکت شروع ہو گئی۔ ترنم اُنھوں نے غضب کا پایا تھا اور شعر بھی صاف، سادہ اور پاکیزہ کہتے تھے لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے ادبی حلقوں میں خاص مقام حاصل کر لیا یہاں تک کہ جب حضرت نیاز فتح پوری نے "نگار" کے ایک شمارے میں لکھنؤ کے اساتذۂ سخن کی فہرست نمونۂ کلام کے ساتھ شائع فرمائی تو والدصاحب قبلہ کا نام اس فہرست میں شامل تھا اور نمونۂ کلام کے طور پر یہ

شعر نقل کیا گیا تھا :

دو آنسو بہہ گئے تو ہوئی درد میں کمی
رونے کا ورنہ شوق نہیں چارہ گر مجھے

پھر ہمارے گھر پر بھی نشستیں ہونے لگیں جن میں یہ تمام حضرات شرکت فرماتے تھے۔ اُسی زمانے میں حضرت قدیر لکھنوی اور حضرت آسی کی سفارش پر مجھے طرحی مشاعروں میں شرکت کی اجازت مل گئی۔

۱۹۳۵ء میں والد صاحب کے انتقال کے بعد اِن حضرات کی ہمارے گھر آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر والد صاحب کے تمام احباب کی خدمت میں میری حاضری بدستور جاری رہی۔ یہ تمام حضرات بھی مجھ پر شفقت فرماتے رہے اور مقامی نشستوں میں میری شرکت بھی ہوتی رہی جس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ برادرم آرم لکھنوی کی معیت میں حضرت آرزو، حضرت صفی اور حضرت اثر لکھنوی تک رسائی کی سبیل نکل آئی۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی ابتدائی دو دو غزلیں ان تینوں بزرگوں کی خدمت میں پیش کیں اور اُنھوں نے بڑی محبت سے میری رہنمائی فرمائی۔ ارادہ میرا یہ تھا کہ ان بزرگوں میں سے جس کو اپنی طبیعت کے مطابق پاؤں گا اس کے دامنِ ہدایت سے وابستہ ہو جاؤں گا لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل مجھے سرکاری ملازمت کا پروانہ مل گیا اور لکھنؤ کو خیر باد کہہ دینا پڑا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ راہِ سخن میں جو خود اعتمادی و ثابت قدمی مجھے نصیب ہوئی اسے میں انہیں بزرگوں کی ہمت افزائی کا صلہ جانتا ہوں۔

چار سال تک مقامی مشاعروں میں شرکت کے بعد میں نے قدم گھر سے باہر نکالا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میرا پہلا بڑا مشاعرہ وہ تھا جو ۱۹۴۲ء میں فہیم کالج۔ کانپور کی جانب سے نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں ملک کے تمام مشاہیر نے شرکت فرمائی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پوری سرگرمی و تواتر کے ساتھ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا جب میں ڈھاکے چلا گیا۔ ساڑھے سات آٹھ سال کا یہ زمانہ وہ تھا جب جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، احسان دانش، روش صدیقی، اثر لکھنوی و مجاز لکھنوی کی شمولیت کسی بڑے

مشاعرے کے کامیاب ہونے کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اسی زمانے میں میری غزلیں "آج کل"، "ساقی"، "ادبِ لطیف"، "ہمایوں"، "نیرنگِ خیال" اور "زمانہ" میں شائع ہونا شروع ہوئیں۔

۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ پہنچا تو وہاں ایک شاندار ادبی محفل سجی دیکھی جس میں علّامہ رضا علی وحشت، ڈاکٹر عندلیب شادانی، سید فضل احمد کریم فضلی، مولانا تمنّا عمادی، حیدر دہلوی اور کیفی چریاکوٹی جیسے قد آور غزل گو شعراء تشریف فرما تھے اور خاصی بڑی تعداد میں دیگر خوش گو شعراء کلکتہ۔ یو۔پی اور بہار سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ سلیم اللہ فہمی، آصف بنارسی، فطرت واسطی، احسن احمد اشک، افسر ماہ پوری، عابد داناپوری، رشید احمد، شمس شیدائی اور شبیر علی کاظمی ان میں نمایاں تھے۔ سرور بارہ بنکوی اُس وقت تک وہاں نہیں پہنچے تھے سو وہ بھی ۱۹۵۱ء میں آ گئے۔

مقامی شعراء میں سید شرف الحسینی، مرزا فقیر محمد، خواجہ اسماعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل، اور ظہور المیار کی پیش پیش تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجمن ترقئ اردو کی شاخ کے علاوہ شہر شہر ادبی انجمنیں قائم ہو گئیں اور آئے دن نشستوں اور مشاعروں کا بازار گرم ہو گیا۔ سال میں کم از کم ایک کُل پاک و ہند مشاعرہ بھی منعقد ہونے لگا جس میں ہندوستان اور سابق مغربی پاکستان کے قریب قریب تمام مشاہیر کی شرکت باری باری ہوتی تھی یعنی ایسی فضا میسر آئی کہ احساس ہی باقی نہ رہا کہ اُدھر سے نکل کر کسی نئی جگہ جا پہنچا ہوں۔

اگرچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری، مختار زمن، ڈاکٹر آفتاب صدیقی، نور الرحمان، واحد بخش قادری، محمد اظفر اور کلیم اللہ فہمی شعر نہیں کہتے تھے لیکن ان کے دم سے وہاں کی محفلوں میں بڑی رونق تھی۔ انہیں حضرات میں نظیر صدیقی، ارشد کاکوی جیسے مستقبل کے وقیع ادیب بھی تھے جن کی ادبی زندگی کا آغاز وہیں میرے سامنے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری رونق تھی ہی نظر لگ جانے والی چنانچہ اُسے نظر لگی اور ایسی لگی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ خاک میں مل گیا اور وہ مکتبۂ فکر جو تیز رفتاری کے ساتھ دبستانِ مشرق کی شکل اختیار کر رہا تھا نذرِ سقوط ہو گیا۔

یوں زندگی کے بیس قیمتی سال مشرقی پاکستان میں گزارنے کے بعد فروری ۱۹۷۰ء میں

پنشن لے کر میں بھائی صاحب کے پاس لاہور آگیا۔ میری خاطر بھائی صاحب نے اپنے گھر پر ماہانہ نشستوں کا اہتمام کیا جس میں ناصر کاظمی، صوفی تبسم، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور محبوب خزاں سے قربت حاصل ہوتی رہی اور مقامی مشاعروں میں پنجاب کے دوسرے شعراء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جن میں ضمیر جعفری، مظفر وارثی اور کلیم عثمانی نمایاں تھے۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں لاہور سے کراچی آگیا جہاں میرے قیام کو تقریباً گیارہ برس ہو رہے ہیں۔ اس قیام کے دوران میں کراچی نے مجھے جو عزت اور محبت دی اس کا شکریہ ادا کرنے کو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "مضراب" برادرم مظفر احمد بھٹا کی کوشش اور بُردک بانڈ کے تعاون سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اور نعتوں کا پہلا مجموعہ "قابَ قوسَین" محترمہ بیگم اے۔ کے سومار کی توجہ اور محترم اے۔ کے سومار کی عنایت سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا اور یہ دونوں کتابیں اہلِ علم و ادب کی نگاہ میں پذیرائی کی مستحق ٹھہریں۔ اب مضراب و رباب آپکے سامنے ہے۔ میں اِن ادب دوست کرم فرماؤں کی خدمت میں خصوصیت کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں جنھوں نے گذشتہ دو کتابوں پر التفات فرما کر زیرِ نظر کتاب کی اشاعت پر مائل کیا۔

پچھلے گیارہ برسوں میں مجھے بے شمار مشاعروں اور نشستوں میں شرکت کا موقع ملا جن کے توسط سے یہاں کے تمام بزرگ و خُرد سخن وروں سے خوشگوار تعلقات پیدا ہوتے چلے گئے لیکن افسوس کہ اُن میں سے متعدد اہم شخصیتیں ہماری محفلوں کو ویران کر گئیں۔ نجم آفندی، سید آلِ رضا، رعنا اکبر آبادی، سید محمد جعفری، ماہر القادری، ابن انشا، سراج الدین ظفر، زیڈ۔ اے۔ بخاری، بہزاد لکھنوی، مصطفیٰ زیدی، سرور بارہ بنکوی، بہار کوٹی، شیوہ بریلوی، اَمیر گلاوٹھی، منظر جلیل شوق، غلام محی الدین اشرفی، عزیز الحق، شجاع الرحمان اثر سعید، عزیز مظہر، اے۔ ڈی اظہر، حکیم اشرف و اظہر نفیس اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اسی طرح ربع صدی تک کمال وضع داری کے ساتھ ہفتہ واری محفلِ شعر سجانے والے غلام محمد صالح بھی ہم سے مُنہ موڑ گئے

لیکن جب کبھی کوئی مخصوص نشست منعقد ہوتی ہے تو صابح صاحب کی محفل اور اُن کا حسنِ اخلاق یاد آجاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ سخن وروں میں سے ہر ایک کی رحلت نے کراچی کی ادبی زندگی میں ایک خلاء پیدا کر دیا۔ تاہم یہ بات بھی طمانیت کے لئے کم نہیں کہ ہماری نئی نسل جس میں کچھ ذہین و باصلاحیت نوعمر خواتین بھی شامل ہیں اُس اعتبار کو برقرار رکھنے میں پختہ مشق شعراء کا ہاتھ بٹا رہی ہے جو دبستانِ کراچی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہر میں نئے شعراء و شاعرات کی تعداد بڑی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ گھروں پر منعقد ہونے والی مخصوص محافل میں بھی تیس ۳۰ پینتس ۳۵ سخن وروں کا موجود ہونا اب ایک معمول سا بن گیا ہے اور یہ صورتِ حال یقیناً خطرناک اور معیارِ شاعری کے حق میں مُضر ہے جس کی طرف توجہ کی فوری ضرورت ہے پھر بھی کراچی کی مشینی زندگی اور خالصتاً معاشی فضا میں نوجوانوں سے اس قسم کے اشعار سُنتا ہوں تو جی خوش ہوتا ہے، گردن فخر سے اونچی ہوتی ہے اور مستقبل کی روشنی صاف نظر آنے لگتی ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر اس سے ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
(پروین شاکر)

اس ترکِ رفاقت کا مجھے رنج ہے لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت ہے
(پروین شاکر)

تھکن بہت تھی مگر سایۂ شجر میں جمالؔ
میں بیٹھتا تو مرا ہم سفر چلا جاتا
(جمالؔ احسانی)

اب اس سے کیجے کیا شکوہ ہائے کم نگہی
بہت دنوں میں تو اس نے اِدھر نظر کی ہے
(جمالؔ احسانی)

وہ مجھے خوشیاں نہ دے اور میری آنکھیں نم نہ ہوں
یہ ہے پیماں زندگی کے اور میرے درمیاں
(حسن جمال اکبر)

اگر چلو تو مرے ساتھ ہی چلو لیکن
کٹھن سفر سے زیادہ ہے ہم سفر ہونا (پیرزادہ قاسم)

صبح کا بھولا ہوا شام کو آسکتا ہے
اپنی دہلیز پہ اک دیپ جلائے رکھنا (امتیاز ساغر)

دریچے تو سارے کھلے ہیں مگر
دھواں ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں (نام یاد نہیں)

کپاس چنتے ہوئے ہاتھ کتنے پیارے لگے
مجھے زمیں سے محبت کے استعارے لگے (عشرت آفریں)

بات کردار کی ہوتی ہے وگرنہ عارف
قد میں انسان سے سایہ بھی بڑا ہوتا ہے (راشد عارف)

سوچتا تھا غم میں بھر آتی ہیں آنکھیں کس لئے
چوٹ اپنے دل پہ جب کھائی تو اندازہ ہوا (غافل اکبرآبادی)

جب مرے گھر میں لگی آگ تو معلوم ہوا
کون اپنا ہے یہاں، کون تماشائی ہے (ایچ رحیم)

تھا کون مرے قتل کی دیتا جو گواہی
لوگوں نے تو کھولے نہیں دروازے بھی گھر کے (حسن اللہ ہما)

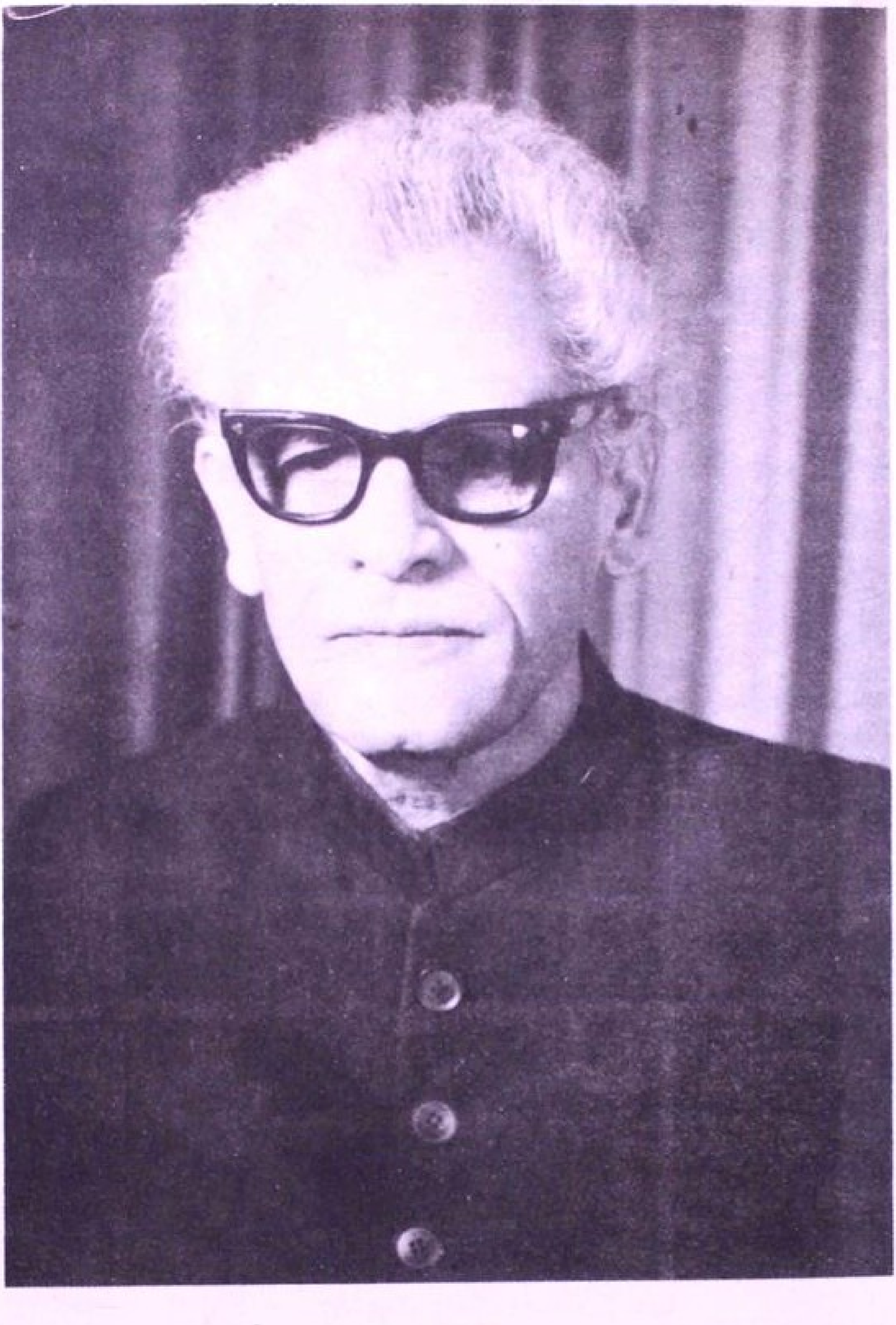
میں نے اکثر عشرت آفریں، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، انور شعور اور سلیم کوثر جیسے نوجوانوں کو اکثر اچھے اچھے شعر پڑھتے سنا ہے لیکن وہ پوری طرح مجھے یاد نہیں اس لئے انھیں چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں جو میرا مقصد سمجھ لینے کو کافی ہیں۔

مستقبل کی روشنی کا ذکر خود میرے مستقبل کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ میرے سامنے کراچی کے شعری ادب کا مستقبل ہے جس کے روز افزوں ارتقاء کے لئے میں دعا گو ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا سوال ہے، میں زندگی کے سرد گرم مرحلوں سے خوش و ناخوش گزر آیا اور اب ہر سانس کے ساتھ خود کو منزلِ آخرت کے قریب تر محسوس کرتا ہوں، اس لئے

میرا مستقبل کیا اور اُس کی روشنی کیا ؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب کبھی کسی بزمِ سخن میں شرکت ہوتی ہے تو سارا ماضی سمٹ کر میری بند آنکھوں میں اُتر آتا ہے اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ اگر میرے شوقِ غزل گوئی نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو نظر بندی کی موجودہ زندگی کتنی ویران گزرتی۔ شاید دروازے پر دستک دینے والا بھی کوئی میسر نہ آتا اس لئے کہ میرے اور میرے رفیقوں، شناساؤں اور چھوٹے بڑے قدردانوں کے درمیان محبت کا جو رشتہ ماضی میں قائم ہوا اور اب بھی قائم ہے وہ فی الحقیقت غزل ہی کے توسط سے تھا اور ہے۔ زندگی میں جو کچھ عزت مجھے حاصل ہوئی اور میرے قارئین و سامعین کے دلوں میں میرے لئے جو کچھ بھی جگہ پیدا ہوئی اس کا سہرا بھی میری غزل ہی کے سر ہے۔ میری غزل نے ریاست رام پور سے کلکتے تک ہندوستان کے تمام بارونق شہروں کی سیر کرائی اور برِ صغیر کے جملہ قابلِ ذکر سخنوروں سے ملاقات کا شرف بخشا۔ میری غزل ہی لکھنؤ اور اودھ کی رومان پرور فضا میں میری شریکِ سفر رہی اور میری غزل ہی نے زندگی کے وہ ناقابلِ فراموش شب و روز عطا کئے جو میں نے بیس سال تک مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں میں گزارے۔ یہ میری غزل ہی کا کرشمہ تھا کہ نقلِ وطن کے بعد بھی کلکتہ، لکھنؤ، دیوا شریف، راولپنڈی اور کراچی اور کراچی میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے دعوت ناموں نے ڈھاکہ جیسے دور افتادہ مقام تک میرا تعاقب کیا اور یہ احسانِ عظیم بھی میری غزل ہی کا ہے کہ اُس کی بدولت مجھے سرزمینِ حجاز تک پہنچنے اور آستانِ رسولؐ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میری بجھی ہوئی آنکھوں کے باوجود مدینے کی گلیوں تک میری محفوظ اور معتبر رہنمائی مجھ پر غزل کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اب میں خود اپنی غزل کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ دیارِ رسولؐ تک رسائی کو میں اپنی زندگی کا حاصل اور ذوقِ غزل گوئی کا سب سے بڑا انعام جانتا ہوں جس کے لئے میرے بدن کا رُواں رُواں اللہ تعالیٰ کے کرم بے حد کا شکر گزار ہے۔

جس وقت میں یہ آخری چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں اس سے کچھ دیر پہلے مجھے نیویارک کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اِس قسم کی دعوت کسی شاعر کے لئے بھی ایک اعزاز کی بات ہے اور جھوٹ کیوں بولوں میں بھی اِس بات پر خوش ہوں بلکہ مشروط رضامندی کا اظہار بھی کر چکا ہوں۔ اگر یہ مشاعرہ منعقد ہوا اور میرے ڈاکٹر نے بائیس ۲۲ گھنٹے کے ہوائی سفر کی اجازت دیدی تو انشاء اللہ شرکت کا امکان ہے لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ نیویارک کے اہلِ ذوق کے بجائے مدینے کی گلیوں کا کوئی گداگر مجھے آواز دے میں اُڑ کر وہاں جا پہنچوں اور گنبدِ خضرا کے زیرِ سایہ بابِ جبریل کی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری زندگی نعتِ رسولؐ کہتا رہوں پڑھتا رہوں کہتا رہوں پڑھتا رہوں۔ وہ نعت جسکی راہ بھی مجھے میری غزل نے سجھائی ہے۔

اقبال عظیم



مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں اُنھیں بھی نظر نہیں آتا

41-C, Officers Colony,
Garden Road,
Karachi

۱۷ مارچ ۸۲ء

'مضراب' بھائی وقار کی اجازت سے شائع ہوئی تھی۔ وہ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب کس سے پوچھوں؟

اب ان سے وابستگی کی صورت اس کے سوا اور کیا ہے کہ یہ کتاب انھیں کے نام سے منسوب کردوں یعنی برادر بزرگ مرحوم سید وقار عظیم کے نام سے۔

اقبال عظیم

ترتیب

غزلیات

(قافیے اور ردیفیں)

مضراب

رباب

مِضرابْ

حمد
ربّ العالمین

تیری مدحت اور میں معذور و سرتاپا قصور
میں کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ، اتنا شعور

صرف تیرے آسرے پر لب کشا ہوتا ہوں میں
اس سعادت کی مجھے توفیق دے ربِ غفور

غنچہ و گُل آئینہ تیرے جمالِ قدس کا
ماہ و انجم سے عیاں تیری تجلّی، تیرا نور

ہے رواں تیرے اشارے پر نظامِ کائنات
گردشِ افلاک بھی سجدہ کناں تیرے حضور

ذرہ ذرہ خاکداں کا تیری عظمت کا نقیب
بُوٹا بُوٹا گلستاں کا تیری قدرت کا ظہور

سرخرو ہیں تیری رحمت سے ترے سجدہ گزار
سرنگوں ہے تیرے آگے کفر و باطل کا غرور

مل چکا اقبالؔ کو سب کچھ تری سرکار سے
بخش دے اس کی خطائیں بھی مرے ربِ غفور

رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْن
نعت

سوزِ دل چاہیئے، چشمِ نم چاہیئے اور شوقِ طلب معتبر چاہیئے
ہوں میسّر مدینے کی گلیاں اگر، آنکھ کافی نہیں ہے نظر چاہیئے

اپنی رُوداد غم میں سناؤں کسے، میرے دُکھ کو کوئی اور سمجھے گا کیا
جس کی خاکِ قدم بھی ہے خاکِ شفا، میرے زخموں کو وہ چارہ گر چاہیئے

اُن کی محفل کے آداب کچھ اور ہیں، لب کُشائی کی جرأت مناسب نہیں
اُن کی سرکار میں التجا کے لئے جنبشِ لب نہیں، چشمِ تر چاہیئے

میں گدائے درِ شاہِ کونین ہوں، شیش محلوں کی مجھ کو تمنّا نہیں
ہو میسّر زمیں پر کہ زیرِ زمیں، مجھ کو طیبہ میں اک اپنا گھر چاہیئے

ان نئے راستوں کی غلط روشنی، ہم کو راس آئی ہے اور نہ راس آئے گی
ہم کو کھوئی ہوئی روشنی چاہیئے، ہم کو آئینِ خیرُ البشرؐ چاہیئے

گوشہ گوشہ مدینے کا پُرنور ہے، سارا ماحول جلوؤں سے معمور ہے
شرط یہ ہے کہ ظرفِ نظر چاہیئے، دیکھنے کو کوئی دیدہ ور چاہیئے

مدحتِ سرورِ دوجہاں کے لئے صرف لفظ و بیاں کا سہارا نہ لو
فنِّ شعری ہے اقبالؔ اپنی جگہ، نعت کہنے کو خونِ جگر چاہیئے

○

اک خطا ہم از رہِ سادہ دلی کرتے رہے
ہر تبسم پر قیاسِ دوستی کرتے رہے

ایسے لوگوں سے بھی ہم ملتے رہے دل کھول کر
جو وفا کے نام پر سوداگری کرتے رہے

خود اندھیروں میں بسر کرتے رہے ہم زندگی
دوسروں کے گھر میں لیکن روشنی کرتے رہے

سجدہ ریزی پائے ساقی پر کبھی ہم نے نہ کی
اپنے اشکوں سے علاجِ تشنگی کرتے رہے

اپنے ہاتھوں آرزوؤں کا گلا گھونٹا کئے
زندہ رہنے کے لئے ہم خودکشی کرتے رہے

ہر طرف جلتے رہے بجھتے رہے جھوٹے چراغ
اور ہم سامانِ جشنِ تیرگی کرتے رہے

حالِ دل کہہ دیں کسی سے، بارہا سوچا مگر
اس ارادے کو ہمیشہ ملتوی کرتے رہے

خود کو دیتے بھی رہے ترکِ تعلّق کا فریب
اور در پردہ کسی کو یاد بھی کرتے رہے

اس طرح اقبالؔ گزری ہے ہماری زندگی
زہرِ غم پیتے رہے اور شاعری کرتے رہے

○

کچھ ایسے زخم بھی ہم دل پہ کھائے بیٹھے ہیں
جو چارہ سازوں کی زد سے بچائے بیٹھے ہیں

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

نہ خوفِ بادِ مخالف، نہ انتظارِ سحر
ہم اپنے گھر کے دیے خود بجھائے بیٹھے ہیں

ہمارا ذوق جدا، وقت کا مزاج جدا
ہم ایک گوشے میں خود کو چھپائے بیٹھے ہیں

ہمارے دل میں ہیں محفوظ چند تاج محل
جنھیں ہم اپنا مقدر بنائے بیٹھے ہیں

زمانہ دیکھا ہے ہم نے ہماری قدر کرو
ہم اپنی آنکھوں میں دنیا بسائے بیٹھے ہیں

ہم اپنی ذات سے اک عہد ہیں مگر اقبالؔ
ہم اپنے آپ کو قصداً بھلائے بیٹھے ہیں

○

آنکھوں سے نور، دل سے خوشی چھین لی گئی
ہم سے ہماری زندہ دلی، چھین لی گئی

اک روز اتّفاق سے ہم مسکرائے تھے
اُس کی سزا میں، ہم سے ہنسی چھین لی گئی

اربابِ کم نظر بھی ہیں، جلووں سے فیض یاب
دیدہ وروں سے، دیدہ وری چھین لی گئی

کتنے چراغ نور سے، محروم ہو گئے
جب سے ہماری خوش نظری چھین لی گئی

شکوہ مرا مزاج، نہ ماتم مری سرِشت
ہر چند مجھ سے خندہ لبی چھین لی گئی

صد شکر بالخصوص نوازا گیا مجھے
آنسو عطا ہوئے ہیں، خوشی چھین لی گئی

اقبالؔ، اِس خوشی کا بھروسہ بھی کچھ نہ تھا
اچھا ہوا، یہ دردِ سری چھین لی گئی

○

روشنی مجھ سے گریزاں ہے تو شکوہ بھی نہیں
میرے غم خانے میں کچھ ایسا اندھیرا بھی نہیں

پُرسشِ حال کی فرصت تمھیں ممکن ہے نہ ہو
پُرسشِ حال طبیعت کو گوارا بھی نہیں

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر
تم نے دیکھا بھی نہیں، ہم نے پکارا بھی نہیں

عرضِ احوال کی عادت بھی نہیں ہے ہم کو
اور حالات کا شاید یہ تقاضا بھی نہیں

بے نیازانہ گزر جائے گزرنے والا
میرے پندار کو اب شوقِ تماشا بھی نہیں

ہاتھ پھیلاؤں میں عیسیٰ نفسوں کے آگے
درد پہلو میں مرے ہے مگر اِتنا بھی نہیں

اک شکن ماتھے پہ دیکھی تھی تمھارے ہم نے
پھر کبھی آنکھ اُٹھا کر تمھیں دیکھا بھی نہیں

آخری بار ہنسی آئی تھی کب ، یاد نہیں
اور پھر آئے ہنسی اِس کی تمنّا بھی نہیں

میرے حالات نہ بدلے تو نہ بدلیں اقبالؔ
مجھ کو حالات پہ کچھ ایسا بھروسہ بھی نہیں

○

شکستِ ظرف کو پندارِ رندانہ نہیں کہتے
جو مانگے سے ملے ہم اُس کو پیمانہ نہیں کہتے

جہاں ساقی کے پائے ناز پر سجدہ ضروری ہو
وہ بُت خانہ ہے، اُس کو رند میخانہ نہیں کہتے

جنوں کی شرطِ اول ضبط ہے اور ضبط مشکل ہے
جو دامن چاک کر لے اُس کو دیوانہ نہیں کہتے

جو ہو جائے کسی کا مستقل، بے شرکتِ غیرے
وہ دل کعبہ ہے، اُس دل کو صنم خانہ نہیں کہتے

نہایت شکریہ اِس پُرسشِ احوال کا لیکن
ہمیں عادت نہیں، ہم اپنا افسانہ نہیں کہتے

جہاں ہر وقت اِک محفل سجی ہو تیری یادوں کی
اُسے عشرت کدہ کہتے ہیں غم خانہ نہیں کہتے

غرض کچھ بھی ہو ہم کو یاد تو رکھتا ہے ہر لحظہ
عدو کو اپنے ہم اقبالؔ! بیگانہ نہیں کہتے

○

غم تو ہے لیکن، غمِ پیہم نہیں ہے، کم سے کم
آنکھ شاید نم ہو، دامن نم نہیں ہے، کم سے کم

زخمِ دل اپنی جگہ باقی ہے، یہ سچ ہے مگر
زخمِ دل کو حاجتِ مرہم نہیں ہے، کم سے کم

یہ نہیں کہتا کہ میں ہر رنج سے محفوظ ہوں
لیکن اب مافات کا ماتم نہیں ہے، کم سے کم

دل کا عالم آج بھی بے شک بہت مشکوک ہے
جو کبھی پہلے تھا وہ عالم نہیں ہے، کم سے کم

آپ نے کوشش نہ فرمائی سمجھنے کی کبھی
ورنہ میری داستاں مبہم نہیں ہے، کم سے کم

وہ سہارا ہے سہی، رسماً سہی، پرسش تو کی
یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ برہم نہیں ہے، کم سے کم

اور کوئی فائدہ محرومیوں کا ہو نہ ہو
اب مجھے احساسِ بیش و کم نہیں ہے، کم سے کم

یوں بظاہر زندگی سے مطمئن کوئی نہیں
آرزو جینے کی پھر بھی کم نہیں ہے، کم سے کم

مختلف ہوتا ہے سب سے کج کلاہوں کا مزاج
زخم خوردہ ہوں، مگر سر خم نہیں ہے، کم سے کم

مثلِ گُل دل خون ہے اقبالؔ لیکن شکر ہے
مثلِ شبنم گریۂ کم کم نہیں ہے، کم سے کم

○

خود فریبی کو، ستم ہے آرزو کہتے ہیں لوگ
شوقِ گمراہی کو ذوقِ جستجو کہتے ہیں لوگ

زہر کے ہر گھونٹ کو دیتے ہیں خوش ذوقی کا نام
خودسری کو لذتِ جام و سبو کہتے ہیں لوگ

زخمِ دل پر ڈال دیتے ہیں مُقدّر کی نقاب
چاکِ پیراہن کو اعجازِ رفو کہتے ہیں لوگ

دیدہ و دانستہ دیتے ہیں نگاہوں کو فریب
پھول کے چاکِ جگر کو رنگ و بو کہتے ہیں لوگ

ہم کو دل جوئی میں بھی ہے پردہ داری کا خیال
اور دل آزاری کی باتیں رُو برُو کہتے ہیں لوگ

اِس دیارِ غیر میں وہ لُٹ چکی مدت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ

اِس بیانِ حال سے اقبالؔ اب حاصل بھی کیا
چارہ سازی کے عوض لاتقنطو کہتے ہیں لوگ

○

باالاہتمام ظلم کی تجدید کی گئی
اور ہم کو صبر و ضبط کی تاکید کی گئی

اوّل تو بولنے کی اجازت نہ تھی ہمیں
اور ہم نے کچھ کہا بھی تو تردید کی گئی

انجامِ کار بات شکایات پر رُکی
پُرسش اگرچہ ازرہِ تمہید کی گئی

تجدیدِ التفات کی تجویز رد ہوئی
ترکِ تعلقات کی تائید کی گئی

اپنی زباں سے میں نے کبھی کچھ نہیں کہا
پھر بھی مرے خلوص پہ تنقید کی گئی

جینے کا کوئی ایک سہارا تو چاہیے
ڈر ڈر کے کی گئی، مگر اُمید کی گئی

گھر کے چراغ اور بھی بے نُور ہو گئے
اس درجہ خاطرِ مہ و خورشید کی گئی

○

ہم نے مانا اِس زمانے میں ہنسی بھی جُرم ہے
لیکن اس ماحول میں افسردگی بھی جُرم ہے

دشمنی تو خیر ہر صورت میں ہوتی ہے گناہ
اِک معین حد سے آگے دوستی بھی جُرم ہے

ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی اُمید
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جُرم ہے

اِس سے پہلے زندگی میں اتنی پابندی نہ تھی
اب تو جیسے خود وجودِ زندگی بھی جُرم ہے

آدمی اِس زندگی سے بچ کے جائے بھی کہاں
میکشی بھی جُرم ہے، اور خودکُشی بھی جُرم ہے

سادگی میں جان دے بیٹھے ہزاروں کوہ کن
آدمی سوچے تو، اتنی سادگی بھی جُرم ہے

کتنی دیواریں کھڑی ہیں ہر قدم پر راہ میں
اور ستم یہ ہے کہ شوریدہ سری بھی جُرم ہے

ایک ساغر کے لیے جو بیچ دیں اپنا ضمیر
ایسے رِندوں کے لیے تشنہ لبی بھی جُرم ہے

اپنی بے نوری کا ہم اقبالؔ، ماتم کیوں کریں
آج کے حالات میں دیدہ وری بھی جُرم ہے

○

زہر دے دے نہ کوئی گھول کے پیمانے میں
اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی میخانے میں

سارا ماضی مری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے
میں نے کچھ شہر بسا رکھے ہیں ویرانے میں

بے سبب کیسے بدل سکتا ہے رندوں کا مزاج
کچھ غلط لوگ چلے آئے ہیں میخانے میں

جامِ جم سے نگہِ توبہ شکن تک، ساقی
پوری رُوداد ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

پیاس کانٹوں کی بُجھاتا ہے لہو سے اپنے
کتنی بالغ نظری ہے ترے دیوانے میں

مجھ پہ تنقید بھی ہوتی ہے تو القاب کے ساتھ
کم سے کم اِتنا سلیقہ تو ہے بیگانے میں

اس کو کیا کہتے ہیں اقبالؔ کسی سے پوچھو
دل نہ اب شہر میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

○

درد بڑھ کر خود دوا ہو جائے تو ہم کیا کریں
چارہ گر ہم سے خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

عین ممکن تھا کہ ہم بھی غم سے پا جاتے نجات
دل مگر غم آشنا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم زباں سے کچھ کہیں تو آپ کا شکوہ بجا
کوئی آنسو لب کُشا ہو جائے تو ہم کیا کریں

اپنی جانب سے تو کی ہم نے ہمیشہ احتیاط
پھر بھی بھولے سے خطا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکمِ سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں

ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا
ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں

معذرت کرنے کو ہم کر لیں، مگر کس جُرم کی
بے سبب کوئی خفا ہو جائے تو ہم کیا کریں

بے وفا کہہ کر تمھیں ہم خود بھی پچھتائے مگر
بے رخی حد سے سوا ہو جائے تو ہم کیا کریں

شکوہ سنجی کی ہمیں اقبالؔ عادت تو نہیں
زندگی صبر آزما ہو جائے تو ہم کیا کریں

○

پرستش اِس کی فطرت ہے، یہ دیوانہ نہ بدلے گا
چراغوں کے بدل جانے سے پروانہ نہ بدلے گا

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں
فقط ساقی بدل جانے سے میخانہ نہ بدلے گا

جو ممکن ہو تو سچ مچ کے اُجالے ڈھونڈھ کر لاؤ
چراغِ مضمحل کی ضَو سے غم خانہ، نہ بدلے گا

کمی ہے اس میں کرداروں کی، مقصد کی، تاثُّر کی
فقط سُرخی بدل جانے سے افسانہ نہ بدلے گا

سَروں پر تاج رکھ لینے کو سلطانی نہیں کہتے
نہ بدلا ہے یہ اندازِ گدایانہ، نہ بدلے گا

کسی گوشے سے کوئی غزنوی اُٹھے تو ہم جانیں
بتانِ خود تراشیدہ سے بُت خانہ نہ بدلے گا

دلوں کی تیرگی کا کچھ کرو اے اہلِ کاشانہ
فقط جشنِ چراغاں سے یہ کاشانہ نہ بدلے گا

○

کچھ ایسے زخم بھی درپردہ ہم نے کھائے ہیں
جو ہم نے اپنے رفیقوں سے بھی چھپائے ہیں

یہ کیا بتائیں کہ ہم کیا گنوا کے آئے ہیں
بس اِک ضمیر بمشکل بچا کے لائے ہیں

یہ کربِ تشنہ لبی اب ہمیں قبول نہیں
کچھ آج سوچ کے ہم، میکدے میں آئے ہیں

کوئی ہواؤں سے کہہ دے اِدھر کا رُخ نہ کریں
چراغ ہم نے سمجھ بُوجھ کر جلائے ہیں

چمن میں اب کے ہوا دیکھیے کدھر کی چلے
خزاں نصیبوں نے پھر آشیاں بنائے ہیں

بدل ہی جاتا ہے غربت میں آدمی کا مزاج
کبھی کبھی ہمیں دشمن بھی یاد آئے ہیں

جہاں بھی ہم نے صدا دی، یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں، پوچھو، کہاں سے آئے ہیں

سفر پہ نکلے ہیں ہم پورے اہتمام کے ساتھ
ہم اپنے گھر سے کفن ساتھ لے کے آئے ہیں

اُنھیں پرائے چراغوں سے کیا غرض اقبالؔ
جو اپنے گھر کے دیے خود بجھا کے آئے ہیں

○

ہم بہت دُور نکل آئے ہیں چلتے چلتے
اب ٹھہر جائیں کہیں، شام کے ڈھلتے ڈھلتے

اب غمِ زیست سے گھبرا کے کہاں جائیں گے
عمر گزری ہے اِسی آگ میں جلتے جلتے

رات کے بعد سحر ہو گی مگر کس کے لئے
ہم ہی شاید نہ رہیں رات کے ڈھلتے ڈھلتے

روشنی کم تھی مگر اتنا اندھیرا تو نہ تھا
شمعِ امّید بھی گُل ہو گئی جلتے جلتے

آپ وعدے سے مُکر جائیں گے رفتہ رفتہ
ذہن سے بات اُتر جاتی ہے ٹلتے ٹلتے

ٹوٹی دیوار کا سایہ بھی بہت ہوتا ہے
پاؤں جل جائیں اگر دھوپ میں چلتے چلتے

دن ابھی باقی ہے اقبالؔ ذرا تیز چلو
کچھ نہ سُوجھے گا تمھیں شام کے ڈھلتے ڈھلتے

○

خوشی کا نام نہ لینا، خوشی کا ٹھیک نہیں
سفر میں ساتھ کسی اجنبی کا ٹھیک نہیں

یہ آفتاب کی رونق بھی کتنی دیر کی ہے
قدم بڑھائے چلو، روشنی کا ٹھیک نہیں

سحر نہیں ہے، یہ شاید نظر کا دھوکا ہے
چراغ گُل نہ کرو، تیرگی کا ٹھیک نہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لُٹ جائے
ذرا سنبھل کے چلو، زندگی کا ٹھیک نہیں

خدا بچائے گلستاں کو باغبانوں سے
یہ گُل فروش ہیں، اِن میں کسی کا ٹھیک نہیں

خود اپنے حال پہ ہنستے ہوں یہ بھی ممکن ہے
جو دل شکستہ ہیں اُن کی ہنسی کا ٹھیک نہیں

مزید عرضِ تمنّا سے فائدہ اقبالؔ؟
جو وعدہ پہلے ہوا تھا اسی کا ٹھیک نہیں

○

بارہا اُن سے نہ ملنے کی قسم کھاتا ہوں میں
اور پھر یہ بات قصداً بھول بھی جاتا ہوں میں

ڈوبتے دیکھے ہیں اِن آنکھوں سے اِتنے آفتاب
روشنی کے نام سے بھی اب لرز جاتا ہوں میں

اتنی افسردہ دِلی اللہ دشمن کو نہ دے
لوگ ہنستے ہیں تو جی ہی جی میں شرماتا ہوں میں

بے رُخی کو اُن کی سچ مچ بے رُخی سمجھا کیا
آج اپنی اس غلط فہمی پہ پچھتاتا ہوں میں

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا مجھ کو تنہا چھوڑ دے
جانے کیوں اب غم گساری سے بھی گھبراتا ہوں میں

○

ہم پیاسوں کے میخانے میں یوں جام چلے ہے
آنکھوں سے چھلک جائے ہے جب شام ڈھلے ہے

کیا پوچھو ہو ہم خانہ خرابوں کی کہانی
مٹّی کا دِیا رُخ پہ ہواؤں کے جلے ہے

تھک جائیں تو سو جائیں کسی پیڑ کے نیچے
ہم خانہ بدوشوں کا یونہی کام چلے ہے

ڈیوڑھی سے تری آج میں کچھ لے کے ٹلوں گا
ٹلتی ہی چلی جائے ہے، جب بات ٹلے ہے

ہم باتیں بھی کر لے ہیں سرِ بزم کسی سے
آنکھوں سے محبت میں بڑا کام چلے ہے

چمکے تو ہے سورج کی طرح حُسن تمھارا
لیکن یہ سمجھ رکھیو کہ سورج بھی ڈھلے ہے

اے سروِ سرافراز ذرا دیکھ کے چلیو
اک شہرِ خموشاں ترے قدموں کے تلے ہے

دیوانے کے ہاتھوں میں یہ مٹّی ہے کہاں کی
چوُمے ہے کبھی اور کبھی آنکھوں سے ملے ہے

جو جاوے ہے کوُچے میں ترے آوے ہے گھائل
تلوار کھنچے ہے نہ کوئی تیر چلے ہے

دیوانے کی یہ بات، بڑی بات ہے پیارے
سب پوچھے ہیں لیکن وہ ترا نام نہ لے ہے

ماحول کا شکوہ کبھی اقبالؔ نہ کیجو
وہ پھول بھی مہکے ہے جو کانٹوں میں پلے ہے

○

اِس بھری محفل میں اپنا مدعا کیسے کہیں
اِتنی نازک بات اُن سے برملا کیسے کہیں

ان کی بیگانہ روی کا رنج ہے ہم کو مگر
ان کو خود اپنی زباں سے بے وفا کیسے کہیں

وہ خفا ہیں ہم سے شاید بربنائے احتیاط
اُن کی مجبوری کو بے سمجھے جفا کیسے کہیں

اہلِ محفل لے اُڑیں گے اِس ذرا سی بات کو
اُن کے اندازِ حیا پر مرحبا کیسے کہیں

خود ہماری ذات سے کیا فیض پہنچا ہے اُنھیں
دوستوں کی بے رُخی کو ناروا کیسے کہیں

جس قدر وہ باخبر ہے ہم سے، کوئی بھی نہیں
اپنے دشمن کو بھلا نا آشنا کیسے کہیں

اُن کو جب خود ہی نہ ہو اقبالؔ اپنوں کا خیال
بے حیا بن کر کہو ہم مدعا کیسے کہیں

○

بظاہر بے رُخی ہے اور کرم پوشیدہ پوشیدہ
تخاطب اب بھی ہوتا ہے مگر دزدیدہ دزدیدہ

وہ کیا آئے مری خلوت میں میخانہ چلا آیا
نظر خوابیدہ خوابیدہ قدم لغزیدہ لغزیدہ

شکستِ حُسن کے منظر بھی اِن آنکھوں نے دیکھے ہیں
رُخِ افسردہ افسردہ، لبِ لرزیدہ لرزیدہ

کوئی یوں سُن رہا تھا رات مجھ سے میرا افسانہ
کبھی شرمندہ شرمندہ، کبھی نم دیدہ نم دیدہ

تعلق اُن سے باقی ہے فقط صاحب سلامت تک
ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں مگر سنجیدہ سنجیدہ

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

وہی اقبالؔ، جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
نظر آتا ہے محفل میں بھی کچھ رنجیدہ رنجیدہ

○

سفر میں عمر کٹی اور دھوپ میں بھی چلے
مگر نہ پیر ہمارے تھکے نہ پاؤں جلے

قدم اُٹھے ہیں تو منزل بھی مل ہی جائے گی
سفر طویل و مسلسل سہی، چلے تو چلے

تم اپنی بزم کی رونق کا اہتمام کرو
ہمارے گھر کے چراغوں کا کیا جلے نہ جلے

جو زر خرید محبت بھی خوش نصیبی ہے
تو خوش نصیبوں سے ہم جیسے بدنصیب بھلے

تمھارے بعد چراغوں کا کام ہی کیا تھا
نہ تم ہی لوٹ کے آئے نہ پھر چراغ جلے

کسی کا بوجھ کوئی اور کیا اُٹھائے گا
سِسک رہا ہے زمانہ خود اپنے بوجھ تلے

نہ جانے کون سی منزل پہ کارواں لوٹا
کوئی نہیں جو مرے ساتھ دو قدم بھی چلے

پرانی باتوں کا کیا ذکر اِس زمانے میں
اندھیرا اب نہیں ہوتا کہیں چراغ تلے

کسی کی یاد نے دامن بڑھا دیا اقبالؔ
چھلک گئیں مری آنکھیں کبھی جو شام ڈھلے

○

اے اہلِ وفا دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
سوئے ہوئے زخموں کو جگا کیوں نہیں دیتے

اس جشنِ چراغاں سے تو بہتر تھے اندھیرے
اِن جھوٹے چراغوں کو بُجھا کیوں نہیں دیتے

جس میں نہ کوئی رنگ نہ آہنگ نہ خُوشبو
تم ایسے گلستاں کو جلا کیوں نہیں دیتے

دیوار کا یہ عذر سُنا جائے گا کب تک
دیوار اگر ہے تو گرا کیوں نہیں دیتے

چہروں پہ جو ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں نقابیں
اُن لوگوں کو محفل سے اُٹھا کیوں نہیں دیتے

توبہ کا یہی وقت ہے کیا سوچ رہے ہو
سجدے میں جبینوں کو جُھکا کیوں نہیں دیتے

یہ جھوٹے خدا مل کے ڈبو دیں گے سفینہ
تم ہادیِ برحق کو صدا کیوں نہیں دیتے

اُن کو مری وفاؤں کا اقرار بھی نہیں
اور پوچھیے تو جرأتِ انکار بھی نہیں

میرے خلوص پر جو بھروسہ نہ ہو تمھیں
مجھ کو تعلّقات پہ اصرار بھی نہیں

ہیں میرے غمگسار اگر مجھ سے بدگماں
میں غمگساریوں کا طلب گار بھی نہیں

گُل کر دیے چراغ کسی نے تو کیا ہوا
اب روشنی سے ہم کو سروکار بھی نہیں

کام اُن سے آپڑا ہے مقدر کی بات ہے
ہم جن سے گفتگو کے روادار بھی نہیں

اُن راستوں سے ہو کے گزر آئی زندگی
جن راستوں میں سایۂ دیوار بھی نہیں

ماضی بہت عزیز ہے اقبالؔ کو، مگر
وہ عہدِ رفتگاں کا عزادار بھی نہیں

○

شورِ منزل طلبی اپنی جگہ باقی ہے
شوقِ گمراہ روی اپنی جگہ باقی ہے

یہ نہیں ہے کہ میں محرومِ کرم ہوں، لیکن
شدّتِ تشنہ لبی اپنی جگہ باقی ہے

اور ہر چیز بدل ڈالی وطن والوں نے
بس غریب الوطنی اپنی جگہ باقی ہے

کوئی دامن ہے سلامت نہ گریباں محفوظ
دعوئ بخیہ گری اپنی جگہ باقی ہے

اور خدشہ کوئی رستے میں کہیں ہو کہ نہ ہو
خدشۂ راہ بری اپنی جگہ باقی ہے

میں تو سمجھا تھا کہ لے ڈوبیں گے حالات مجھے
شکر ہے زندہ دلی اپنی جگہ باقی ہے

تم نہ دیکھو یہ الگ بات ہے ورنہ اقبالؔ
شہر کی جلوہ گری اپنی جگہ باقی ہے

○

خوشی سے چوٹ کھا لیتے ہیں، نَم دیدہ نہیں ہوتے
جو اہلِ دل ہیں آسانی سے رنجیدہ نہیں ہوتے

زمانہ ہم پہ ہنستا ہے، مگر ہم کچھ نہیں کہتے
ہنسی کی بات میں ہم لوگ سنجیدہ نہیں ہوتے

کنارے بھی مُمد ہوتے ہیں تشکیلِ تلاطم میں
وہ خوابیدہ نظر آتے ہیں، خوابیدہ نہیں ہوتے

بڑے اسرار پوشیدہ ہیں اس تنہا پسندی میں
یہ مت سمجھو کہ دیوانے، جہاں دیدہ نہیں ہوتے

چمن کی سیر ہم کرتے ہیں لیکن خوش نگاہی سے
فقط محظوظ ہو لیتے ہیں، گرویدہ نہیں ہوتے

تصوّر خود بنا لیتا ہے آوازوں سے تصویریں
مری محفل میں نادیدہ بھی نادیدہ نہیں ہوتے

تعجّب کیا اگر اقبالؔ دنیا مجھ سے ناخوش ہے
بہت سے لوگ دنیا میں پسندیدہ نہیں ہوتے

O

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ مِلا بھی ہے
اِس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دوسرا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اُس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

غرقاب کر دیا تھا ہمیں ناخدا نے آج
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

ساقی خفا ہے مجھ سے یہ معلوم ہے مجھے
لیکن وہ میرے ظرف کو پہچانتا بھی ہے

اے قافلے کے لوگو ذرا جاگتے رہو
سُنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں، چراغ بھی ہے، آئینہ بھی ہے

ہو تو رہی ہے کوششِ آرائشِ چمن
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

یہ حسنِ اتّفاق ہے یا حسنِ اہتمام
ہے جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے

اقبالؔ شکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے

○

زہر کے گھونٹ بھی ہنس ہنس کے پیے جاتے ہیں
ہم بہرحال سلیقے سے جیے جاتے ہیں

ایک دن ہم بھی بہت یاد کیے جائیں گے
چند افسانے زمانے کو دیے جاتے ہیں

ہم کو دنیا سے محبت بھی بہت ہے لیکن
لاکھ الزام بھی دنیا کو دیے جاتے ہیں

بزمِ اغیار سہی، از رہِ تنقید سہی
شکر ہے ہم بھی کہیں یاد کیے جاتے ہیں

ہم کیے جاتے ہیں تقلیدِ روایاتِ جنوں
اور خود چاکِ گریباں بھی سیے جاتے ہیں

غم نے بخشی ہے یہ محتاط مزاجی ہم کو
زخم بھی کھاتے ہیں آنسو بھی پیے جاتے ہیں

حال کا ٹھیک ہے اقبالؔ نہ فردا کا یقیں
جانے کیا بات ہے ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

○

کیسی آہیں، کیسے آنسو، کیسا غم
ہم کو دیکھو، کس طرح زندہ ہیں ہم

کوئی کس دل سے کہے رُودادِ غم
آپ بھی ہیں آبدیدہ، ہم تو ہم

رہبر و رہزن کا رستہ ایک ہے
کیا خبر، کس کے ہیں یہ نقشِ قدم

مجھ کو عرضِ حال کی عادت نہیں
منتظر ہے آج تک چشمِ کرم

جو ہوا، تقدیر کے ہاتھوں ہوا
کوئی بھی مجرم نہیں ہے، تم نہ ہم

اُن کے ذوقِ جستجو کو کیا کہیں
جو ہیں پابندِ نشاناتِ قدم

اس کو کیا کہتے ہیں خود ہی سوچیے
آستیں نم، آنکھ نم، دامن بھی نم

دوستی کے کچھ تقاضے بھی تو ہیں
پُرسشِ احوال تو ہو کم سے کم

لطف تو اقبالؔ اُن راہوں میں ہے
ہر قدم پر جن میں ہوں کچھ پیچ و خم

ایک سجدہ سرفروشانہ بصد عجز و نیاز
یوں ادا ہوتی ہے اربابِ محبت کی نماز

آرزو الزام، شکوہ جرم، مایوسی گناہ
ہو سزا مقصود تو سَو ہیں بہانے سو جواز

باوجودِ ضبطِ غم، باوصفِ ترکِ گفتگو
کھل ہی جاتے ہیں نگاہوں سے دلوں کے چند راز

کون سنتا ہے کسی کی اس خراب آباد میں
مختصر لمحاتِ فرصت اور افسانے دراز

اہلِ محفل یہ بھلا دیتے ہیں فرطِ شوق میں
گُل بھی ہو سکتی ہیں شمعیں، ٹوٹ بھی سکتے ہیں ساز

عشق میں پندارِ سلطانی بھی کھا جاتا ہے مات
ایک مردِ بُت شکن اور بندۂ زلفِ ایاز

مِل گئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوالوں کے جواب
یوں بھری محفل میں بھی جاری رہے راز و نیاز

○

بس ہو چکا حضور یہ پردے ہٹائیے
سب منتظر ہیں، سامنے تشریف لائیے

آوازیں تو آپ کی بے شک خلوص ہے
لیکن ذرا نقاب تو رُخ سے اُٹھائیے

ہم مانتے ہیں آپ بڑے غم گُسار ہیں
لیکن یہ آستین میں کیا ہے دکھائیے

اب قافلے کے لوگ بھی منزل شناس ہیں
آخر کہاں کا قصد ہے، کُھل کر بتائیے

صحنِ چمن میں آگ لگی، روشنی ہوئی
اِس روشنی سے اپنا شبستاں سجائیے

لُٹ تو چکی بہار، اُجڑ تو چکا چمن
اب کیا ہے، خوب جشنِ بہاراں منائیے

بادہ کشوں کی اصل جگہ میکدے میں ہے
کِس نے کہا کہ آپ بھی منبر پہ آئیے

گھر پھونک کر جناب مگر مطمئن نہ ہوں
شعلے قریب آ گئے دامن بچائیے

روئے سخن ہے کس کی طرف یہ نہ پوچھیے
"پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے"

○

نقاب پوشوں کو للہ رہنما نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو

تمہارا نام ہے منسوب کج کلاہوں سے
گداگروں کی طرح عرضِ مدعا نہ کرو

قصور کس کا ہے اپنے ضمیر سے پوچھو
خدا کے واسطے تقدیر کا گلہ نہ کرو

دعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوائے درد بھی ڈھونڈھو فقط دعا نہ کرو

صفیں درست کرو اور قدم ملا کے بڑھو
یہ وقت اور ہے اب صرف التجا نہ کرو

جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو
گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

ہر ایک بات کا اک وقت ہے سخن سازو
مجادلے کی گھڑی میں مشاعرہ نہ کرو

○

غزل کے ساز پر نغمہ سُنا کر کیا کریں گے
ہم اپنے ساتھ اوروں کو رُلا کر کیا کریں گے

ہمارا غم، ہمارا ایک ذاتی مسئلہ ہے
زمانے بھر کو افسانہ سُنا کر کیا کریں گے

مسیحا اپنے ہی زخموں کا ماتم کر رہے ہیں
ہم اپنا زخمِ دل، اُن کو دکھا کر کیا کریں گے

ابھی باقی ہے تھوڑا سا لہُو قلبِ حزیں میں
ابھی سے اہلِ دل، آنسو بہا کر کیا کریں گے

چمن کے لوگ جب خود ہیں شریکِ گُل فروشی
تو ہم اپنا نشیمن ہی بچا کر کیا کریں گے

تعلّق اب بھی باقی ہے پُرانے دوستوں سے
نئے لوگوں کو ہم دشمن بنا کر کیا کریں گے

جسے دیکھو وہی اقبالؔ مصروفِ بُکا ہے
ہمیں بے وجہ جبراً مُسکرا کر کیا کریں گے

○

صرف ترتیبِ چمن کام تھا فرزانوں کا
حفظِ ناموسِ چمن فرض ہے دیوانوں کا

صرف تنقید سے ممکن نہیں تجدیدِ بہار
اور بھی کچھ ہے تقاضا ترے ویرانوں کا

صرف رہبر ہی کو الزام پہ الزام نہ دو
راہ دشوار ہے اور ساتھ ہے نادانوں کا

حقِّ تنقید تمھیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ
جائزہ لیتے رہو اپنے گریبانوں کا

تشنہ کاموں پہ بھی پڑنے لگی ساقی کی نظر
ہم نے دستور بدل ڈالا ہے میخانوں کا

اک قدم اور بہ پندارِ یقینِ محکم
رُخ بدل سکتا ہے بڑھتے ہوئے طوفانوں کا

اب کے لگ جائے تو لگ جائے کنارے کشتی
ورنہ معلوم ہے انجام مسلمانوں کا

○

بستیاں خاموش ہیں خلقِ خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں ساری فضا خاموش ہے

ایک ایسا سانحہ پیش آگیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں خود رہنما خاموش ہے

پا شکستہ ہو کے یوں بیٹھا ہے سارا قافلہ
دم بخود ہیں منزلیں بانگِ دِرا خاموش ہے

اس صفِ ماتم میں سب اپنے پرائے ہیں شریک
آشنا خاموش ہے، نا آشنا خاموش ہے

میکدوں میں رند افسردہ ہیں پیمانے اُداس
خانقاہوں میں غرورِ اتقا خاموش ہے

ہم نے ناموسِ براہیمؑ کو رُسوا کر دیا
اس خطا پر وسعتِ ارض و سما خاموش ہے

عظمتِ اسلاف کے ماتھے پہ بَل ہیں سیکڑوں
اس ہزیمت پر وقارِ کربلا خاموش ہے

ہم نے حقِ مغفرت کو اپنا ورثہ جان کر
یہ تصوّر کرلیا تھا قہرِ خدا خاموش ہے

اب خطا کاروں میں توبہ کی جسارت بھی نہیں
وہ ندامت ہے کہ خود دستِ دعا خاموش ہے

اب ہوا ہے ہم کو احساسِ خطا بعد از خطا
آنکھ پُر نم ہے زبانِ التجا خاموش ہے

اب بھی ممکن ہے مگر سارے گناہوں کا علاج
یہ نہ سمجھو چشمۂ عفوِ خطا خاموش ہے

دل سے کی جائیں تو ہوتی ہیں دعائیں مستجاب
یہ غلط ہے مالکِ ہر دوسرا خاموش ہے

کیا عجب یہ آزمائش ہو ہمارے ظرف کی
بر بنائے مصلحت شاید خدا خاموش ہے

○

چمن کی خاک تجدیدِ بہاراں چاہتی ہے
نئے ہاتھوں سے تہذیبِ گلستاں چاہتی ہے

بہاراں ساز و سامانِ بہاراں چاہتی ہے
نئے دامن، نئے چاکِ گریباں چاہتی ہے

فقط ذکرِ سحر سے تابہ کے تسکینِ خاطر
سحر، سچ مچ سحر، شامِ غریباں چاہتی ہے

چراغوں کے عوض دوزخ کے شعلے بھی گوارا
کہ اب ظلمت بہر قیمت چراغاں چاہتی ہے

عزائم سے تبسّم مانگتی ہے چشمِ گریاں
تبسّم اور تبسّم برق ساماں چاہتی ہے

○

راتوں کو کچھ چراغوں سے چمکا دیا گیا
ہم کو سحر کے نام پہ دھوکا دیا گیا

زنداں بھی تاکہ ہم کو گلستاں دکھائی دے
کُنجِ قفس کو پھولوں سے مہکا دیا گیا

جھوٹے چراغ بزم میں روشن کیے گئے
جلووں کا زہر آنکھوں میں ٹپکا دیا گیا

زخموں پہ تاکہ اوروں کی نظریں نہ پڑ سکیں
زخمی بدن سلیقے سے کفنا دیا گیا

مقتل کو نامِ گنجِ شہیداں عطا ہوا
نغموں سے سوگواروں کو بہلا دیا گیا

جشنِ شکست ہم نے منایا بالاہتمام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا

ہم نے وفا کے نام پہ کیا کچھ نہیں دیا
لیکن یہ سوچیے کہ ہمیں کیا دیا گیا؟

رُخ لاکھ منزلوں کے بدلتے چلے گئے
ہم اضطرابِ شوق میں چلتے چلے گئے

دیوانے جب اُٹھے تو فضائیں بدل گئیں
صد ہا چراغ راہ میں جلتے چلے گئے

طوفان آئے، حشر اُٹھے، آندھیاں چلیں
لیکن قدم کچھ اور سنبھلتے چلے گئے

یوں بھی ہوا ہے عزمِ غلط میں کبھی کبھی
ہم اپنی حد سے آگے نکلتے چلے گئے

عزمِ سفر گروہوں میں تقسیم ہو گیا
سب اپنی اپنی راہ بدلتے چلے گئے

اپنا ضمیر بیچ کے نیند آ گئی ہمیں
سارے اصول خوابوں میں ڈھلتے چلے گئے

ہم اپنی منزلوں کا تعیّن کیے بغیر
کیا جانے کس خیال میں چلتے چلے گئے

ظلمت کو ہم نے اپنا مُقدّر بنا لیا
لمحے طلوعِ صبح کے ٹلتے چلے گئے

نظریں بدل گئی تھیں تو کچھ ایسا غم نہ تھا
ذہنوں کے زاویے بھی بدلتے چلے گئے

اقبالؔ ہم سے کوئی مخاطب نہیں ہوا
یہ کون لوگ تھے، جو نکلتے چلے گئے

○

حادثاتِ سحر و شام کو الزام نہ دو
حسبِ عادت غمِ ایّام کو الزام نہ دو

تم نے خود نُور کا ظلمت سے کیا ہے سودا
کر کے توہینِ سحر، شام کو الزام نہ دو

تم نے خود اپنے پَر و بال کی تعظیم نہ کی
اب فریبِ قفس و دام کو الزام نہ دو

تم نے پیغام کا مفہوم غلط سمجھا تھا
مقصدِ صاحبِ پیغام کو الزام نہ دو

عین مقصود سمجھ بیٹھے تھے آغاز کو تم
اب اُس آغاز کے انجام کو الزام نہ دو

اپنے مشکوک عزائم کو عزائم کہہ کر
پَے بہ پَے کوششِ ناکام کو الزام نہ دو

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردشِ ایّام کو الزام نہ دو

○

اُن کو یہ اصرار ہے اُن سے خطا ممکن نہیں
ایسی صورت میں تو کوئی فیصلہ ممکن نہیں

اپنی اُفتادِ طبیعت کو میں آخر کیا کروں
اور سب ممکن ہے، عرضِ مدعا ممکن نہیں

صرف اُن کے مشورے پر منحصر ہے زندگی
اور ستم یہ ہے کہ اُن سے مشورہ ممکن نہیں

دوستی کے بعض پہلو چاہتے ہیں تبصرہ
اور دل آزاری کے ڈر سے تبصرہ ممکن نہیں

زندہ رہنے کے لیے ہم زہر بھی پیتے رہے
زندگی دشوار ہو سکتی ہے، ناممکن نہیں

کوہ کن کے نام سے زندہ ہے پندارِ جنوں
آدمی چاہے تو اِس دنیا میں کیا ممکن نہیں

اُن کو خود آجائے تو اقبالؔ آجائے خیال
کم سے کم میری زباں سے التجا ممکن نہیں

ہم سفر میں ہیں فقط پُر پیچ راہوں کے لئے
حادثے معمول ہیں ہم کج کلاہوں کے لئے

سرزنش، تنقید، نفرت، تلخیاں، رسوائیاں
نصب ہیں کتنی صلیبیں بے گناہوں کے لئے

اُن سے کوئی کیا کہے، بے خواب غم خانوں کا حال
ساری نیندیں وقف ہیں جن خواب گاہوں کے لئے

اُن سے بہتر شہر کی بے نُور گلیوں کا سکوت
قافلے بیتاب ہیں جن شاہراہوں کے لئے

اُن کو کیا معلوم بے رونق خرابوں کا مقام
وقف ہیں جن کی جبینیں بارگاہوں کے لئے

تیرگی تو پیش خیمہ ہے طلوعِ صبح کا
تیرگی اک عذر ہے گم کردہ راہوں کے لئے

خوش نگاہی شرط ہے اقبالؔ! راہِ شوق میں
روشنی بھی تیرگی ہے کم نگاہوں کے لئے

○

قدم قدم پہ فریبِ نظر، چمن کا چمن
نظر غریب بچائے کہاں کہاں دامن

بہار ہو کہ خزاں دونوں ترجمانِ چمن
مزاج ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیراہن

نہ باغباں، نہ بہاراں، نہ غنچہ و شبنم
چمن، چمن کو بناتے ہیں کچھ تہی دامن

تمھارے دعوئے ساقی گری کا کیا کہنا
تمھارے پاس ہی بیٹھے ہیں چند تشنہ دہن

یہ اور بات ہے اہلِ چمن کو یاد نہیں
کبھی بہارِ چمن تھے یہ چاک پیراہن

یہ چاند تارے بجھا دے کوئی تو اچھا ہو
کہ اِن سے ہوتی ہے کچھ اور تیرگی روشن

زمانہ سازی کا فن ہم نے کیوں نہیں سیکھا
ہم اہلِ ظرف ہیں خود اپنی جان کے دشمن

○

کچھ ایسی شمعیں جلائی گئی ہیں محفل میں
کہ روشنی بھی نگاہوں کو روشنی نہ لگے

اک ایسے شخص سے بھی راہ و رسم ہے اپنی
جو بے رُخی سے ملے اور اجنبی نہ لگے

عجیب حال ہے کچھ اِن دنوں طبیعت کا
کہ غم بُرا نہ لگے اور خوشی، خوشی نہ لگے

کہاں سے سیکھی ہے ظالم نے یہ سبک دستی
کہ دل کا خون بھی ہو جائے چوٹ بھی نہ لگے

کچھ اپنا حال بھی ہم آپ کو سنا دیتے
ہماری بات اگر آپ کو بُری نہ لگے

کوئی بتاؤ کہ وہ جائے تو کہاں جائے
خود اپنے گھر میں بھی جس آدمی کا جی نہ لگے

کچھ ایسے دوست بھی اکثر ہمیں ملے اقبالؔ
کہ جن کی تلخ نوائی بھی دشمنی نہ لگے

جو بے وفا نظر آتا ہے باوفا ہی نہ ہو
یہ بے رخی بھی محبت کی اک ادا ہی نہ ہو

ہم آدمی سے فرشتے تو بن نہیں سکتے
وہ چاہتے ہیں کہ ہم سے کبھی خطا ہی نہ ہو

اب اتنی سادہ دلی بھی خدا کسی کو نہ دے
کہ وہ کسی سے کسی بات پر خفا ہی نہ ہو

بس ایک شکل ہے چارہ گروں سے بچنے کی
وہ زخم کھاؤ کہ جس کی کوئی دوا ہی نہ ہو

یہ کس کی لاش نظر آ رہی ہے ساحل پر
چلو قریب سے دیکھیں وہ ناخدا ہی نہ ہو

شیوخِ شہر کو تم دیکھ کر پلٹ آئے
کسی سے پوچھ تو لیتے وہ میکدہ ہی نہ ہو

میں اپنی بے نگہی پر یہ سوچ کر چپ ہوں
یہ جرم دیدہ وری کی کہیں سزا ہی نہ ہو

○

ہیں مری روداد سے مغموم لوگ
کچھ غلط سمجھے مرا مفہوم لوگ

گھر سے چل کر ہم کہاں تک آ گئے
اجنبی ماحول ، نامعلوم لوگ

اک ذرا آہستہ اے آتش نوا
ہیں اسی محفل میں کچھ مغموم لوگ

لُٹ گئے کل ہم بھرے بازار میں
مل گئے رستے میں کچھ معصوم لوگ

جانے اہلِ ظلم بستے ہیں کہاں
ہم کو ملتے ہیں فقط مظلوم لوگ

تجربوں نے بارہا تنبیہ کی
پھر بھی دھوکا کھا گئے معصوم لوگ

دے گئے اقبالؔ ہم کو زندگی
زندۂ جاوید کچھ مرحوم لوگ

○

وقت بھی توبہ شکن، ماحول بھی توبہ شکن
ایسے عالم میں کسے آواز دیں تشنہ دہن

ایسی صورت میں بیانِ حال دل کا کیا سوال
تم مزاجاً کم سخن، اور ہم اصولاً کم سخن

شانِ محبوبی اِدھر، پندارِ محبوبی اُدھر
میرے ماتھے پر پسینہ، اُن کے ماتھے پر شکن

کتنی با مقصد ہے اُن کی ہر نگاہِ بے نیاز
دل شکن، پیماں شکن، توبہ شکن، ایماں شکن

اُن کی محفل میں ہمارا تذکرہ ہے اِن دنوں
اللہ اللہ ہم بھی ہیں اقبالؔ، موضوعِ سخن

○

غم تو یوں اور بھی تھے آپ کے غم سے پہلے
دل کا یہ حال نہ تھا حُسنِ کرم سے پہلے

ہم پہ الزام ہے، افسردہ مزاجی کا، مگر
اتنی رونق بھی نہ تھی بزم میں ہم سے پہلے

آپ کے لطف و عطا نے ہمیں گستاخ کیا
ہم تو واقف بھی نہ تھے چشمِ کرم سے پہلے

ہم تو پیاسے ہی چلے آتے ہیں میخانے سے
کچھ ثقہ لوگ پہنچ جاتے ہیں ہم سے پہلے

لوگ غیروں کو بھی آنکھوں پہ بٹھا لیتے تھے
وہ بھی اک دور تھا، اِس دورِ ستم سے پہلے

آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جاتے
یہ سزا آپ نہ دیں شکوۂ غم سے پہلے

بات کا پاس، محبت کا بھرم ہے اقبالؔ
یہ بُھلا دیتے ہیں ہم قول و قسم سے پہلے

○

تم غیروں سے ہنس ہنس کے ملاقات کرو ہو
اور ہم سے وہی زہر بھری بات کرو ہو

بچ بچ کے گزر جاؤ ہو تم پاس سے میرے
تم تو بخدا غیروں کو بھی مات کرو ہو

نشتر سا اُتر جاوے ہے سینے میں ہمارے
جب ماتھے پہ بَل ڈال کے تم بات کرو ہو

تقوے بھی بہک جاویں ہیں محفل میں تمھاری
تم اپنی اِن آنکھوں سے کرامات کرو ہو

پھولوں کی مہک آوے ہے سانسوں میں تمھاری
موتی سے بکھر جاویں ہیں جب بات کرو ہو

ہم غیروں کے آگے تمھیں کیا حال بتا دیں
پاس آ کے سُنو دور سے کیا بات کرو ہو

کیا کہہ کے پُکاریں گے تمھیں لوگ یہ سوچو
اقبالؔ پہ تم ظلم تو دن رات کرو ہو

○

یہ ادائے خود فریبی تو مزاج ہے ہمارا
نہ قریب تھا کنارا، نہ قریب ہے کنارا

نہ خطا ہے دوستوں کی نہ قصور ہے تمھارا
مجھے راہِ دوستی میں مری سادگی نے مارا

غمِ زندگی بھی میں نے بخوشی کیا گوارا
نہ کسی سے التجا کی نہ کبھی تمھیں پکارا

جو سفینہ ڈوبتا ہے تو بلا سے ڈوب جائے
مرے ناخدا سے کہہ دو مجھے بخش دے خدا را

مجھے تم نے یاد رکھا یہ کرم بھی کم نہیں ہے
سرِ راہ مجھ کو پوچھا یہ خلوص ہے تمھارا

نہ کبھی زباں کھلی ہے نہ کبھی زباں کھلے گی
جو شکست ہے مقدر تو شکست بھی گوارا

کبھی ہم بھی چاہتے تھے کہ ملیں کہیں سہارے
مگر اب یہ ڈر رہے ہیں کوئی دے نہ دے سہارا

○

اُٹھے تو صبحِ درخشاں، جُھکے تو ظلمتِ شام
تری نگاہ پہ قائم ہے زندگی کا نظام

یہ خم بہ خم ترے گیسو یہ کافرانہ خرام
زفرق تا بقدم شعرِ حافظ و خیّام

تری جبیں پہ طلوعِ سحر کی پہلی کرن
ترے لبوں پہ بہاروں کا اوّلیں پیغام

نظر جُھکی تو ہوا بند بابِ مے خانہ
نظر اُٹھی تو ہوئے چُور چُور شیشہ و جام

بغیر لفظ و بیاں گفتگو سرِ محفل
نفس نفس میں فسانے نظر نظر میں پیام

قدم بڑھیں تو بدل جائے وقت کی رفتار
قدم رُکیں تو ٹھہر جائے گردشِ ایّام

نہ جانے کون سی منزل ہے یہ محبّت کی
نہ پُرسشیں، نہ تخاطب، نہ گفتگو نہ سلام

غلط معنی دیئے جاتے ہیں زیرِ لب تبسّم کو
سمجھ پائے نہ اب تک لوگ اِس خاموش قلزم کو

بڑا دھوکا دیا ہم کو ہماری خوش خیالی نے
نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے نگاہوں کے تصادم کو

محبت میں خطائیں ایک جانب سے نہیں ہوتیں
نہ تم الزام دو ہم کو نہ ہم الزام دیں تم کو

کچھ آنسو پھوٹ نکلے خود بخود کل رات آنکھوں سے
جہاں تک ہو سکا روکے رہے ہم اس تلاطم کو

زباں خاموش، ماتھے پر شکن، آنکھوں میں افسانے
کوئی سمجھائے کیا کہتے ہیں اس طرزِ تکلّم کو

تمھیں ناراض ہونے کا سلیقہ بھی نہیں آتا
شکن ماتھے پہ ڈالو، اور روکو اس تبسّم کو

زمانہ ہو گیا اقبالؔ! ہم اک ساتھ رہتے ہیں
تعجب ہے سمجھ پائے نہ تم ہم کو، نہ ہم تم کو

○

آپ چاہے بھول جائیں قصّۂ عہدِ شباب
آپ کو اب تک دعا دیتے ہیں کچھ خانہ خراب

اس طرح ترتیب پاتی ہے محبت کی کتاب
چند ناگفتہ فسانے، چند بے تعبیر خواب

اک نگاہِ پُرتکلف، سَو خطابوں کا خطاب
ایک زیرِ لب تبسّم، سَو جوابوں کا جواب

میری جانب اُٹھ رہی ہے پھر نگاہِ احتساب
مجھ سے مانگا جا رہا ہے دل کے زخموں کا حساب

کش مکش میں مُبتلا ہے آج ذوقِ انتخاب
چشمِ ساقی رُو برو، پیشِ نظر جامِ شراب

کس نے اپنے روئے روشن سے اُلٹ دی ہے نقاب
ہر طرف بکھرے پڑے ہیں جیسے صدہا آفتاب

اب وہاں اقبالؔ جیسے لوگ ہوں کیا باریاب
اُن کی محفل میں کئی حضرات ہیں گردوں جناب

○

ہر چند گام گام حوادث سفر میں ہیں
وہ خوش نصیب ہیں جو تری رہ گزر میں ہیں

تاکیدِ ضبط، عہدِ وفا، اذنِ بندگی
کتنے پیام، اِک نگہِ مختصر میں ہیں

ماضی شریکِ حال ہے کوشش کے باوجود
دُھندلے سے کچھ نقوش ابھی تک نظر میں ہیں

لِلّٰہ اس خلوص سے پُرسش نہ کیجیے
طوفان کب سے بند مری چشمِ تر میں ہیں

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

محفل میں اُن کی سمت نگاہیں نہ اُٹھ سکیں
ہم بالخصوص اہلِ نظر کی نظر میں ہیں

اقبالؔ ہم کو اپنے عدو سے گلہ نہیں
ہم بھی خدا کا شکر کسی کی نظر میں ہیں

O

تم سے کس نے کہا، میں نے شکوہ کیا؛ خیر جس نے کہا اور جو بھی کہا، کہنے والا غلط فہم و نادان ہے
ہاں کبھی ازرہِ تذکرہ بے خیالی میں ضمناً کوئی بات کہہ دوں یونہی، وہ بھی احباب میں اس کا امکان ہے
ہم جو بھولے سے بھی مسکرائے کبھی، اُن کے ماتھے پہ بل پڑ گئے سیکڑوں، جیسے خوشیاں فقط اُن کی میراث ہیں
یوں بظاہر ملاقات برسوں کی ہے، دل نوازی بھی ہے غمگساری بھی ہے، یعنی اچھی طرح جان پہچان ہے
آگ شعلوں پہ شعلے اُگلتی رہی، باغ جلتا رہا، پھول روتے رہے، لوگ دیکھا کیے اور ہنستے رہے
کوئی سوچے ذرا خود ہی انصاف سے، ایسے حالات میں، ایسے ماحول میں، حفظِ ناموسِ گلشن کا امکان ہے؟
عمر بھر کی وفاؤں کی قیمت ہے یہ؟ یا خلوص و محبت کا انعام ہے؟ ایک چھوٹی سی لغزش پہ برہم ہو تم!
ایک شکوے پہ اتنے خفا ہو گئے! یہ نہ سمجھا مرے دل کا عالم ہے کیا، یہ نہ سوچا کہ انسان انسان ہے
اے مرے دوستو! اے مرے مشفقو! بے زبانی کا مفہوم یہ کب ہوا، تلخ و شیریں کا احساس مجھ کو نہیں؟
یہ الگ بات ہے باوجودِ ستم اپنے دشمن کو بھی میں نہ دشمن کہوں، مجھ کو اپنے پرائے کی پہچان ہے
روٹھے روٹھے سے تم، سہمے سہمے سے ہم، اجنبی اجنبی سے ملے جس طرح، ایسے ملنے سے اچھا نہ ملنا ہی تھا
خیر یہ بھی بہت ہے ہمارے لئے کم سے کم باریابی تو حاصل ہوئی، آپ کی یہ نوازش ہے احسان ہے
کس کی محفل ہے یہ ہم کہاں آ گئے؟ اِن میں اقبالؔ کوئی شناسا بھی ہے؟ کس سے باتیں کریں کس کو آواز دیں
اُن کے چہرے پہ شاید نقابیں بھی ہیں، آستینوں کے اندر چمکتا ہے کچھ، ایسی محفل میں اندیشۂ جان ہے

○

ہر شخص جب سے شہر میں فرزانہ ہوگیا
دیوانہ ضد میں اور بھی دیوانہ ہوگیا

رندوں نے بھی ضمیر فروشی شعار کی
اِک ایسا شخص ساقیِ میخانہ ہوگیا

ساقی کے پائے ناز پہ سجدے کیے گئے
لو میکدہ بھی خیر سے بُت خانہ ہوگیا

رندوں کی کائنات فقط اُن کا ظرف تھا
سو وہ بھی نذرِ سازشِ میخانہ ہوگیا

جی چاہتا ہے چھین لیں ساقی سے میکدہ
لبریز اب تو صبر کا پیمانہ ہوگیا

○

جس انجمن میں دیکھو بیگانے رہ گئے ہیں
گنتی کے لوگ جانے پہچانے رہ گئے ہیں

کہنے کو داستانیں برباد محفلوں کی
اب چند پر شکستہ پروانے رہ گئے ہیں

کل جن حقیقتوں سے ماحول معتبر تھا
آج اُن حقیقتوں کے افسانے رہ گئے ہیں

ویران میکدوں میں رندوں کی یادگاریں
لے دے کے کچھ شکستہ پیمانے رہ گئے ہیں

ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے یگانے
اب غم گساریوں کو بیگانے رہ گئے ہیں

اب ذوقِ بندگی کو سجدوں میں کیا ملے گا
پتھر کی مورتوں کے بُت خانے رہ گئے ہیں

تاریخِ عہدِ رفتہ بالاختصار یہ ہے
گلشن جہاں جہاں تھے ویرانے رہ گئے ہیں

اب غارتِ چمن میں کیا رہ گیا ہے باقی
کچھ پیرہن دریدہ دیوانے رہ گئے ہیں

اقبالؔ ڈھونڈتے ہو تم جن کو محفلوں میں
اُن کی جگہ اب اُن کے افسانے رہ گئے ہیں

○

اگر انساں کا ذوقِ نظر بیدار ہو جائے
نقاب اُٹھے نہ اُٹھے، رُوبرو دیدار ہو جائے

نظر محروم ہو جائے اگر ذوقِ تماشا سے
اندھیرا تو اندھیرا، روشنی بھی بار ہو جائے

وہ منزل نقطۂ آغاز ہے مرگِ مسلسل کا
خود اپنی ذات سے جب آدمی بیزار ہو جائے

یہی جی چاہتا ہے اب گریباں چاک کر ڈالیں
جو ہونا ہے تو رسوائی سرِ بازار ہو جائے

کرم کا آسرا اک خود فریبی ہی سہی، لیکن
جو اِتنا بھی نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے

خدا محفوظ رکھے اُس گھڑی سے میری غیرت کو
کہ دشمن بھی ترس کھا کر مرا غمخوار ہو جائے

محبّت کو سلیقہ ہو اگر حُسنِ تکلّم کا
جو آنسو آنکھ سے ٹپکے، لبِ اظہار ہو جائے

○

جب راس ہی نہ آیا گلشن کا آب و دانہ
تو کیسا آشیانہ اور کس کا آشیانہ

اب کتنے مختصر ہیں آداب دوستی کے
سُنتے رہو فسانہ، کہتے رہو فسانہ

ہر چند زندگی کی قدریں بدل چکی ہیں
اہلِ وفا سے اب بھی خالی نہیں زمانہ

اب جرمِ خودکشی بھی محفوظ ہے سزا سے
ہے کتنا خوبصورت تقدیر کا بہانہ

یہ دل کا بوجھ ہم کو خود بھی نہیں گوارا
لیکن سوال یہ ہے کس سے کہیں فسانہ

○

ہم کہاں جرأتِ سوال کہاں
جاں نثاروں کی یہ مجال کہاں

اُن کی محفل میں حکم چلتا ہے
التجا کا وہاں سوال کہاں

چلتے پھرتے نگار خانے ہیں
اِس زمانے میں خوش جمال کہاں

چھین لیں مجھ سے روشنی میری
اِن اندھیروں کی یہ مجال کہاں

انجمن میں نقاب پوشوں کی
دوست تو ہیں، شریکِ حال کہاں

میں ہی مجبور ہوں طبیعت سے
آپ کو خود مرا خیال کہاں

شاعری کام آ گئی اقبالؔ
ورنہ امکانِ عرضِ حال کہاں

○

نہ جانے فرطِ محبت میں اُن سے کیا کہہ دیں
ہم اِس خیال سے رودادِ غم سنا نہ سکے

ہم، اور آپ پہ تنقید، وہ بھی غیروں میں
ہم اپنے زخم تو اپنوں کو بھی دکھا نہ سکے

ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ ہے، نہ اب ہوگا
یہ اور بات ہے تم کو یقین آ نہ سکے

وہ بزمِ غیر تھی، یہ تو خیال کر لیتے
ذرا سی دیر کو تم برہمی چھپا نہ سکے

وہ لوگ گردشِ دوراں کا ساتھ کیا دیں گے
جو اپنی تیرہ نصیبی پہ مسکرا نہ سکے

○

اپنا گھر چھوڑ کے ہم لوگ وہاں تک پہنچے
صبحِ فردا کی کرن بھی نہ جہاں تک پہنچے

میں نے آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں کچھ اور چراغ
روشنی صبح کی شاید نہ یہاں تک پہنچے

بے کہے بات سمجھ لو تو مناسب ہوگا
اِس سے پہلے کہ یہی بات زباں تک پہنچے

تم نے ہم جیسے مسافر بھی نہ دیکھے ہوں گے
جو بہاروں سے چلے اور خزاں تک پہنچے

آج پندارِ تمنّا کا فسوں ٹوٹ گیا
چند کم ظرف گِلے نوکِ زباں تک پہنچے

○

تم نے دل کی بات کہہ دی آج، یہ اچھا ہوا
ہم تمھیں اپنا سمجھتے تھے، بڑا دھوکا ہوا

جب بھی ہم نے کچھ کہا، اُس کا اثر اُلٹا ہوا
آپ شاید بھولتے ہیں، بارہا ایسا ہوا

اور ہم کرتے بھی کیا، ترکِ تعلق کے سوا
ہم کو خود حیرت ہے، یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوا

اب بھی باقی ہے تمھارے دل میں تھوڑا سا خلوص
اِس سے پہلے بھی ہمیں اکثر یہی دھوکا ہوا

آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کہاں سے آ گئے
ہم تو دیوانے ہیں لیکن آپ کو یہ کیا ہوا

اِس شکر رنجی سے کیا حاصل ہوا، خود سوچیے
آپ بھی رسوا ہوئے، ناچیز بھی رسوا ہوا

اب کسی سے کیا کہیں اقبالؔ اپنی داستاں
بس خدا کا شکر ہے، جو کچھ ہوا اچھا ہوا

○

خواب کو حیلہ بنا کر اک غلط تعبیر کا
لوگ رُونا رُو رہے ہیں آج تک تقدیر کا

کس قدر آسان ہے توجیہِ فردِ جُرم کی
کچھ زمانے کی شکایت کچھ گلہ تقدیر کا

کوئی مردِ کوہکن اُٹھتا ہے جب تیشہ بدوش
جُوئے خوں سے کام لے لیتا ہے جُوئے شیر کا

جب کبھی بیدار ہو جاتا ہے پندارِ جنوں
ٹوٹ جاتا ہے تکبّر حلقۂ زنجیر کا

ایسے بُھولے لوگ بھی زندہ ہیں دنیا میں ابھی
جو خوشی سے مان لیتے ہیں کہا تقدیر کا

میرے زخموں کو نہ چھیڑیں آپ بس یہ دیکھ لیں
خیر مقدم ہو رہا ہے آپ کے ہر تیر کا

آپ کی سنجیدگی کے ہم بھی قائل ہو گئے
سر سے پا تک ہُو بہُو انداز ہے تصویر کا

آپ اب آئے ہیں جب بیمار رُخصت ہو چکا
آپ سے اب کون پوچھے گا سبب تاخیر کا

شعر میں اقبالؔ لازم ہے زبان و فن کے ساتھ
فکر غالبؔ کی، خلوص اقبالؔ کا، غم میرؔ کا

○

جو ہو سکے تو خزاں سے مصالحت کر لو
چمن کے لوگو! بہاروں کا اعتبار نہیں

کنارے موج و تلاطم کی خواب گاہیں ہیں
سفینے والو، کناروں کا اعتبار نہیں

پلک جھپکتے بدلتا ہے رُخ ہواؤں کا
نگاہ والو، نظاروں کا اعتبار نہیں

سہارا آپ کا، بے شک بڑا سہارا ہے
مگر حضور، سہاروں کا اعتبار نہیں

سُنے تو کون سُنے دل کا ماجرا اقبالؔ
شکستہ ساز کے تاروں کا اعتبار نہیں

○

چھیڑا ہے سرِ شام کہیں ساز کسی نے
یا دُور سے دی ہے مجھے آواز کسی نے

ٹوٹے ہوئے تاروں کو ابھی جوڑ رہا تھا
ہاتھوں سے مرے چھین لیا ساز کسی نے

اِک آہ تو کر لی ہے مگر، سوچ رہا ہوں
پہچان نہ لی ہو مری آواز کسی نے

ہم کر نہ سکے جرأتِ اظہارِ تمنا
اِس طرح کیا بات کا آغاز کسی نے

غیروں پہ عنایات ہیں اپنوں سے شکایات
سمجھے نہ کبھی آپ کے انداز کسی نے

توبہ کی جبیں پر ہے ندامت کا پسینہ
رندانہ اُٹھائی نگہِ ناز کسی نے

اقبالؔ یہ آنسو بھی امانت ہیں کسی کی
پایا نہ غمِ دوست کا یہ راز کسی نے

پردے ہی پردے میں شرحِ آرزو ہوتی رہی
رات اُن سے غائبانہ گفتگو ہوتی رہی

جیسے جیسے حادثے دادِ سفر دیتے رہے
ویسے ویسے اور محکم، جستجو ہوتی رہی

جیب و دامن کی برابر دھجّیاں اُڑتی رہیں
لاکھ دیوانوں میں تبلیغِ رفو ہوتی رہی

اذنِ توبہ، بابِ توبہ سے صدا دیتا رہا
اور جواباً خاطرِ جام و سبو ہوتی رہی

لوگ ناکامی کا ماتم برملا کرتے رہے
اور شرحِ آیۂ لَاتَقنَطُو ہوتی رہی

میری معذوری پہ دشمن بھی ترس کھاتے رہے
یوں سرِ بازار رُسوا آبرو ہوتی رہی

دوستی سے ہم جوابِ دشمنی دیتے رہے
اس طرح اقبالؔ! تادیبِ عدو ہوتی رہی

○

خزاں کے بعد چمن میں اماں ملے نہ ملے
جہاں ہے آج نشیمن وہاں ملے نہ ملے

خدا کا شکر کہ ہم تو قریب آ پہنچے
کسی کو منزلِ عمرِ رواں ملے نہ ملے

سفر کا ساتھ تو ویسے بھی کوئی ساتھ نہیں
کوئی رفیق، کوئی کارواں ملے نہ ملے

نظر نظر سے بیاں کر رہی ہے افسانہ
پھر اس کے بعد کوئی ہم زباں ملے نہ ملے

غزل کی روح میں رقصاں ہے داستانِ حیات
کسی کو سلسلۂ داستاں ملے نہ ملے

ق

یہ بات بات میں خوشبو شگفتہ پھولوں کی
یہ خوشگوار فضا، یہ سماں ملے نہ ملے

یہاں سے جائیں کہاں ہم خلوص کے مارے
کہیں یہ انجمنِ دوستاں ملے نہ ملے

غمِ شکست طبیعت کو ناگوار سا ہے
مجھے کچھ اپنے عزائم پہ اعتبار سا ہے

غمِ حیات کبھی تھا غمِ حیات، مگر
غمِ حیات پہ اب مجھ کو اختیار سا ہے

یہ رات ڈھل کے رہے گی سحر میں دیر نہیں
نہ جانے کیوں مجھے فردا پہ اعتبار سا ہے

بہت قریب ہے شاید جلوسِ فصلِ بہار
کہ غنچہ غنچہ گلستاں میں بےقرار سا ہے

طلوعِ مہر کے لمحے قریب آ پہنچے
نجومِ شب کی جبینوں پہ انتشار سا ہے

نفس نفس پہ یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے
نگاہِ وقت کو جیسے کچھ انتظار سا ہے

اُٹھو کہ خواب کے لمحے گزر چکے اقبالؔ
نمودِ صبح سے ماحول سازگار سا ہے

○

آج کل سچ پوچھیے تو مسکراتا کون ہے
خود فریبی ہے فقط، ہنستا ہنساتا کون ہے

میری نیندیں اُڑ گئی ہیں یہ تو کہہ سکتا ہوں میں
یہ مگر مت پوچھیے نیندیں اُڑاتا کون ہے

تم نہیں آتے نہ آؤ، تم سے شکوہ بھی نہیں
تم سے کہتا کون ہے، تم کو بُلاتا کون ہے

تم نہیں سُنتے اگر افسانۂ غم، مت سنو
ہر کس و ناکس کو افسانہ سُناتا کون ہے

اس سے پہلے بھی کیا ہے ہم نے اُن کا اعتبار
ایسے وعدے تو بہت ہوتے ہیں آتا کون ہے

اُن کی محفل دیکھنے کا شوق تو ہم کو بھی ہے
ہم وہاں جاتے، مگر ہم کو بُلاتا کون ہے

فتنہ ہائے دہر کے اقبالؔ شاکی ہیں سبھی
اِن سے یہ پوچھے کوئی فتنے جگاتا کون ہے

دَور میں اوروں کی خاطر پیمانوں پر پیمانے ہیں
سارے میخانے میں جیسے اِک ہم ہی بیگانے ہیں

مدّت کے اِس ساتھ پہ بھی بیگانے کے بیگانے ہیں
دُنیا والے پاگل ہیں، یا ہم ہی کچھ دیوانے ہیں

کس نے کس کا ساتھ دیا ہے، سب جانے پہچانے ہیں
بیگانوں کو کیا کہیے، جب اپنے بھی بیگانے ہیں

ہم نے اِن دو آنکھوں سے مت پُوچھو کیا کچھ دیکھا ہے
اِن سچّی باتوں کو اب تم سمجھو گے افسانے ہیں

وقت کے ہاتھوں اُجڑا ہے یُوں خوشیوں کا شاداب چمن
پیشِ نظر تا حدِ نظر ویرانے ہی ویرانے ہیں

دل کے ویرانے میں اب بھی کچھ کچھ رونق باقی ہے
ارمانوں کے تاج محل ہیں، یادوں کے بُت خانے ہیں

چاک گریباں والوں کو اقبال کوئی کیا سمجھے گا
فرزانوں کے فرزانے ہیں، کہنے کو دیوانے ہیں

○

آنکھوں سے بے ارادہ آنسو ٹپک گئے ہیں
یہ جام، بے سبب بھی، اکثر چھلک گئے ہیں

جب جرأتِ بیاں نے چھوڑا ہے ساتھ میرا
پلکوں سے کچھ فسانے خود ہی ڈھلک گئے ہیں

غُربت میں تیرا دامن جب یاد آگیا ہے
فکر و نظر کی حد تک جادے چمک گئے ہیں

جس جس روش سے ہو کر کوئی گزر گیا ہے
گلشن تو پھر ہیں گلشن، صحرا مہک گئے ہیں

رندانہ اُٹھ گئی ہیں جس سمت وہ نگاہیں
ماحول کی جبیں سے سجدے ٹپک گئے ہیں

اب کون سی زباں میں ہم گفتگو کریں گے
آہیں بھی تھک گئی ہیں آنسو بھی تھک گئے ہیں

ساغر بکف نگاہیں، مینا بدوش گیسو
اِن میکدوں میں اکثر تقوے بہک گئے ہیں

○

ہم تو رسوا ہوئے، وفا کر کے
آپ کو کیا ملا، جفا کر کے

یوں ہی نادم تھے ہم خطا کر کے
اور نادم ہوئے، دعا کر کے

وہ بھی محجوب، ہم بھی شرمندہ
فائدہ کیا ہوا، گلہ کر کے

آج تک ہے شکست کا احساس
آپ سے عرضِ مدّعا کر کے

خود فریبی مزاج ہے اُن کا
کیا کریں اُن سے التجا کر کے

شاید اُن کی سمجھ میں آجائے
دیکھ لیں یہ بھی تجربہ کر کے

گھر میں کس عافیت سے بیٹھے ہیں
ساری دنیا کو ہم خفا کر کے

شعلہ سا ایک شرق میں رقصاں ہوا تو تھا
کچھ رونقِ حیات کا ساماں ہوا تو تھا

پھوٹی تو تھی شفق سے کرن آفتاب کی
کچھ کامیاب خونِ شہیداں ہوا تو تھا

آکر قریب لوٹ گئی صبحِ زندگی
کچھ اعتبارِ گردشِ دوراں ہوا تو تھا

دیکھی پھر اس کے بعد نہ آنکھوں نے روشنی
اک رات غمکدے میں چراغاں ہوا تو تھا

اہلِ چمن نے آگ لگادی بہار میں
ورنہ کچھ اہتمامِ بہاراں ہوا تو تھا

ظلمت کدوں نے دور سے دیکھی تھی روشنی
عشرت کدوں میں رات چراغاں ہوا تو تھا

زندانیوں کو راس نہ آئی بہارِ نو
وا موسمِ بہار میں زنداں ہوا تو تھا

○

نظر نظر میں جگا دی ہے روشنی ہم نے
نفس نفس میں سمو دی ہے نغمگی ہم نے

کلی کلی کو دیا ہے سبق تبسم کا
روش روش پہ بچھا دی ہے تازگی ہم نے

فسردہ حال سہی ہم، خزاں نصیب سہی
ترے چمن کو عطا کی ہے زندگی ہم نے

بجھا کے آئے ہیں ہم اپنی محفلوں کے چراغ
بکھیر دی ہے ترے گھر میں چاندنی ہم نے

گزر کے آنا پڑا اشک و خوں کی موجوں سے
ادا کیا ہے مگر حقِّ دوستی ہم نے

ترا مزاج مگر اب بھی ہم سے برہم ہے
نہ جانے کون سی کی ایسی دشمنی ہم نے

خدا کی شان انھیں زعمِ رہنمائی ہے
جنھیں سکھائے تھے آدابِ رہ روی ہم نے

ہماری خانہ خرابی کو دائمی نہ سمجھ
قسم خدا کی کبھی کی ہے خسروی ہم نے

چُھٹا جو ہاتھ ہمارا تو مِل چکی منزل
بُرا نہ مان حقیقت بیان کی ہم نے

○

اِس زمانے کے بے کیف ماحول میں، ذکرِ رعنائیِ چشم و ابرو کہاں
اب حقائق سے دو چار ہے زندگی، مہلتِ فکرِ رُخسار و گیسو کہاں

اب پرستش کے انداز کچھ اور ہیں، اور پرستش کا مقصد بھی کچھ اور ہے
اب تو بازار ہے اور خریدار ہیں، اب محبت میں اخلاص کی بُو کہاں

تذکرہ جب بھی میرا کیا جائے گا، آپ کا نام بھی بیچ میں آئے گا
آپ ہر چند دامن بچاتے رہیں، عشق میں امتیازِ من و تو کہاں

میں نے رُو رُو کے افسانۂ دل کہا، اور توجّہ سے اُس کو سُنا بھی گیا
شوقِ قربت کو اب اور کیا چاہیئے، اُن کا دامن کہاں میرے آنسو کہاں

پہلے دِلّی چھُٹی، پھر چھُٹا لکھنؤ، لطفِ صحبت ہی اقبالؔ جاتا رہا
اب وہ باتوں میں پھولوں کی خوشبو کہاں اب وہ شیرینیِ قندِ اردو کہاں

○

مجھے شکوہ ہے اپنی چشمِ تر سے
گرا جاتا ہوں خود اپنی نظر سے

دعائیں مانگتے ہیں جو سحر کی
وہ ناواقف ہیں انجامِ سحر سے

ابھی سے لوگ پتّھر چُن رہے ہیں
نہ جانے کون گزرے گا، اِدھر سے

وہاں اب سیکڑوں دانش کدے ہیں
کبھی دیوانے گزرے تھے جِدھر سے

کوئی روزن ہی زنداں میں نہیں ہے
چلو، فرصت ملی فکرِ سحر سے

میں اہلِ کارواں سے پوچھتا ہوں
مِلا کیا اِس غلط عزمِ سفر سے

مقدّر ہو گئی، خانہ بدوشی
نہ جانے کس گھڑی نکلے تھے گھر سے

○

اب اِسے کیا کرے کوئی، آنکھوں میں روشنی نہیں
شہر بھی اجنبی نہیں، لوگ بھی اجنبی نہیں

یوں تو بڑے خلوص سے، لوگ ہوئے ہیں ہم سفر
راہ میں ساتھ چھوڑ دیں، اُن سے بعید بھی نہیں

بیتے ہوئے خوشی کے دن، بھُولی ہوئی کہانیاں
آپ کو یاد ہوں تو ہوں، ہم کو تو یاد بھی نہیں

اپنی اِسی زمین پر بستے ہیں ایسے لوگ بھی
جن کے گھروں میں آج تک، صبح کبھی ہوئی نہیں

ترکِ تعلّقات تک، بات اگر پہونچ گئی
اُس کو کچھ اور کہتے ہیں، صرف وہ برہمی نہیں

○

اُٹھ جاتے ہیں جب چہرۂ ماضی سے حجابات
افسانوں میں ڈھل جاتے ہیں، گزرے ہوئے لمحات

یاد آتی ہے جب عہدِ محبت کی شروعات
آنکھوں سے لہو بن کے چھلک جاتے ہیں جذبات

وہ باتوں ہی باتوں میں، کبھی حرف و حکایات
وہ آنکھوں ہی آنکھوں کبھی رمز و کنایات

بے لفظ و بیاں، کوششِ اظہارِ خیالات
بے جنبشِ لب، نظروں ہی نظروں میں پیامات

کچھ اُن کو شکایات، تو کچھ مجھ کو شکایات
وہ زندۂ جاویدِ محبت کی روایات

دنیا کو دکھانے کے لئے مجھ پہ عتابات
در پردہ مگر سلسلۂ پرسشِ حالات

بھیگی ہوئی پلکوں پہ اِدھر چند سوالات
اور ایک تبسّم میں، اُدھر لاکھ جوابات

لیکن وہ نظر اور وہ الطاف و عنایات
اب میرے لئے ہوگئیں، پارینہ حکایات

کچھ اور ہیں اب میری محبت کے مقامات
اب فکرِ عنایات، نہ احساسِ عتابات

اقبالؔ اِسے کہتے ہیں، نیرنگیٔ اوقات
اب صبح ہے وہ صبح، نہ اب رات ہے وہ رات

○

ہر چند ہم کو تشنہ لبی ناگوار تھی
ساقی سے ہم ضمیر کا سودا نہ کر سکے

سمجھا گیا ہمیں بھی توجہ کا مستحق
اتنی سی بات لوگ گوارا نہ کر سکے

اُن دوستوں سے مجھ کو خصوصی لگاؤ ہے
میرے خلوص پر، جو بھروسا نہ کر سکے

وہ زخمِ دل ہے، زخم نصیبوں کی کائنات
جس زخمِ دل کا کوئی مداوا نہ کر سکے

شکوے پہ اُن کو حُسنِ طلب کا گماں نہ ہو
ہم اِس خیال سے، کبھی شکوہ نہ کر سکے

ملتی ہے اُن گھروں سے چراغوں کو روشنی
سورج بھی جن گھروں میں اُجالا نہ کر سکے

اقبالؔ، اُن سے بات تو کہہ دی کسی طرح
لیکن پھر اس کے بعد، تقاضا نہ کر سکے

○

ہے بپا دل میں حشرِ تلاطم
پھر بھی جاری ہے شغلِ تبسم

خیر مقدم غمِ زندگی کا
ایک بار اور سعئِ تبسم

حوصلے دل کے کم ہو نہ پائیں
اِک تبسم برائے تبسم

آنکھ نم اور ماتھے پر شکنیں
اللہ اللہ یہ حسنِ تکلم

عمرِ رفتہ نے بھی مُڑ کے دیکھا
جب ملے ہیں سرِ راہ ہم تم

پھر پلٹ کر نہ آئے وہ لمحے
ہائے وہ اتفاقی تصادم

اتنی فرصت بھی کچھ کم نہیں ہے
پھر نہ جانے کہاں ہم، کہاں تم

○

جب دل پہ گراں گزری ماحول کی خاموشی
بھُولی ہوئی یادوں سے ہونے لگی سرگوشی

جب زخم کوئی کھایا، ہم شُکر بجا لائے
ہم سے تو نہیں ہوتی احسان فراموشی

آغازِ محبّت کا انجام تو ظاہر تھا
ممکن ہی نہ تھی لیکن انجام سے رُوپوشی

جس غم کو محبّت کی سرکار سے نسبت ہو
توہینِ عقیدت ہے اُس غم سے سبک دوشی

یہ ربطِ خصوصی ہے پہچان محبت کی
اک سمت وفا کیشی، اک سمت جفا کوشی

○

کبھی جو کی گئی کوشش بھی مسکرانے کی
بدل گئی ہیں نگاہیں وہیں زمانے کی

قفس کے لوگو! قفس کا مقام پہچانو
قفس سے راہ نکلتی ہے آشیانے کی

یہ کس کے شہر میں بھولے سے آگئے ہم لوگ
نہ گفتگو کی اجازت نہ مسکرانے کی

چمن کے لوگوں سے دیکھیں نباہ ہو کہ نہ ہو
بنا تو ہم نے بھی ڈالی ہے آشیانے کی

سبھی نے راہ میں اقبالؔ ساتھ چھوڑ دیا
رہیں شریکِ سفر گردشیں زمانے کی

چراغ روشن ہیں انجمن میں فضا ہے لیکن بجھی بجھی سی
شراب شیشوں میں ڈھل رہی ہے، لبوں پہ ہے پھر بھی تشنگی سی

شریکِ محفل ہیں یوں تو ہم بھی مگر باندازِ خود فریبی
مزاجِ محفل بھی اجنبی سا، نگاہِ ساقی بھی اجنبی سی

عجیب منزل پہ آکے ٹھہرے ہیں راہِ امروز کے مسافر
نگاہِ ماضی میں برہمی سی، جبینِ فردا پہ تیرگی سی

فریبِ منزل کا راز افشا ہوا ہے آکر قریبِ منزل
نظر تو آئی تھی دُور سے کچھ سوادِ منزل پہ روشنی سی

شکست کھائی ہے زندگی نے خود اپنے عزمِ غلط کے ہاتھوں
قدم بظاہر تو بڑھ رہے ہیں مگر بہ باطن ہے بے دلی سی

پڑا ہے وہ وقت آدمی پر کہ قلبِ فطرت بھی مضمحل ہے
زمیں کی سانسیں تھکی تھکی سی فلک کی نبضیں رُکی رُکی سی

بہار ہے یہ، خزاں نہیں ہے، سمجھ رہے ہیں یہ ہم بھی، لیکن
قدم قدم پر کھٹک رہی ہے فضائے گلشن میں کچھ کمی سی

نقاب پوشوں کی انجمن میں حقیقتیں یوں چھپی ہوئی ہیں
دلوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں، مگر بظاہر ہے دوستی سی

کسی کو اقبال کیا خبر ہے کہ دل پہ کیا کچھ گزر رہی ہے
ہنسی سمجھتی ہے اس کو دنیا، لبوں پہ کچھ ہے جو کپکپی سی

○

اب آہ بھی سینے سے نکلتی ہے بہ مُشکل
یہ صورتِ حالات بدلتی ہے بہ مُشکل

تسلیم کہ اک شمع کی ضَو کم ہے، بہت کم
اِک شمع بھی ظلمات میں جلتی ہے بہ مُشکل

اس درد کا درماں کوئی آسان نہیں ہے
وہ پھانس ہے دل میں جو نکلتی ہے بہ مُشکل

تدبیر کی عظمت مجھے تسلیم ہے، لیکن
تدبیر سے تقدیر بدلتی ہے بہ مُشکل

جو رات کبھی رشکِ سحر تھی ترے دم سے
وہ رات ترے ہجر میں ڈھلتی ہے بہ مُشکل

جو بات کہی جائے محبّت کی فضا میں
وہ بات کسی دل سے نکلتی ہے بہ مُشکل

اقبالؔ طبیعت کو یہ کیا ہوگیا آخر
اب شدّتِ غم سے بھی بہلتی ہے بہ مُشکل

○

بے کیف سہی، بے رنگ سہی، افسانۂ غم مُبہم ہی سہی
پلکیں تو ہیں نم کچھ آپ کی بھی، تاثیر تو ہے کم کم ہی سہی

جب سامنے تم آجاتے ہو، کچھ مُنہ سے نکل ہی جاتا ہے
تم سے نہ کہیں تو کس سے کہیں، تم اپنی جگہ برہم ہی سہی

کچھ اہلِ وفا اس دنیا میں یادوں کے سہارے زندہ ہیں
جو دَورِ محبت رُوٹھ چکا، اُس دَور کا اب ماتم ہی سہی

تقدیر میں جو لکھا تھا ہوا، بس جانے بھی دو کیا ذکر اُس کا
اب وجہِ تباہی کوئی بھی ہو، وہ تم نہ سہی وہ ہم ہی سہی

یہ آگ سُلگتی یوں کب تک، گُھٹ گُھٹ کے کہاں تک رہتے ہم
کچھ جی تو ہوا ہلکا ہلکا، اک گوشۂ داماں نم ہی سہی

اِک عرضِ تمنّا کی خاطر نظروں سے کسی کی کیوں گرتے
ہم ترکِ تمنّا کر بیٹھے، قسمت میں غمِ پیہم ہی سہی

شکوہ جو زباں پر آ ہی گیا، کیا آن رہی خودداری کی
تقدیر پہ شاکر ہے اپنی، اقبالؔ سراپا غم ہی سہی

○

تری نگاہ کی ہر جُنبشِ حجابانہ
تمام ساغر و مینا تمام میخانہ

ترا تبسّمِ معصوم شعر و افسانہ
تری نگاہ غزل اور غزل بھی رندانہ

نظر نظر میں کسی سے کسی کا افسانہ
بیاں ہوا ہے سرِ بزم رازدارانہ

قدم قدم پہ مُرتّب ہوا ہے افسانہ
جدھر جدھر سے گزرتا گیا ہے دیوانہ

نظامِ قلب و نظر اب ہے آئینہ خانہ
کوئی قریب سے گزرا ہے بے حجابانہ

مرے تصوّرِ رنگیں میں کوئی یوں آیا
چمن میں جیسے چلی آئے شامِ میخانہ

چھُٹا ہے ہاتھ سے دامن کسی کا یوں اقبالؔ
لبوں تک آ کے چھلک جائے جیسے پیمانہ

○

تم اسی طرح ہم سے جو برہم رہے، رُخ ہواؤں کے دیکھو بدل جائیں گے
زندگی کی بہاریں گزر جائیں گی، اور یہ لمحے فسانوں میں ڈھل جائیں گے

آپ سے ہم کو بے شک بہت اُنس ہے، ہم مگر اپنے پندار کو کیا کریں
اپنی توہین ہم کو گوارا نہیں، آپ بدلے تو ہم بھی بدل جائیں گے

آپ ہونٹوں کو جُنبش کی زحمت تو دیں، کم سے کم دل کو تسکین ہو جائے گی
ہم مزاجاً بڑے سادہ دل لوگ ہیں، جھوٹے وعدوں سے بھی ہم بہل جائیں گے

ہمسفر یوں تو اپنے بھی کچھ کم نہیں، اور بظاہر سبھی اہلِ اخلاص ہیں
لیکن انجان لوگوں کا کیا ٹھیک ہے، وقت کے ساتھ یہ بھی بدل جائیں گے

ساتھ خانہ خرابوں کا اچھا نہیں، آپ لِلّٰہ واپس چلے جائیے
اس بیاباں کی تپتی ہوئی ریت پر، آپ کے پھول سے پاؤں جل جائیں گے

وقت کی رَو بہت تیز ہے دوستو، اک ذرا آنکھ جھپکی اگر راہ میں
شوقِ منزل غباروں میں کھو جائے گا، اور منزل کے تیور بدل جائیں گے

بات پہلے جہاں تھی وہیں ہے ابھی، اور اب بھی کہا جا رہا ہے یہی
صبح ہو جائے گی، دن نکل آئے گا، اور یہ پہرے اندھیروں کے ٹل جائیں گے

○

عینِ منزل پہ ہوئی شام، تو پھر کیا ہوگا
جستجو یوں ہوئی ناکام، تو پھر کیا ہوگا

شمعِ اُمّید جلائی تو ہے ڈرتے ڈرتے
بُجھ گئی یہ بھی سرِ شام، تو پھر کیا ہوگا

دامنِ صبر چُھٹا جاتا ہے ہاتھوں سے مرے
آگیا لب پہ ترا نام، تو پھر کیا ہوگا

مجھ کو آغاز کی تلخی بھی گوارا، لیکن
ہو جو آغاز ہی انجام، تو پھر کیا ہوگا

مُسکراتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ ہو یہ بھی اگر
سازشِ گردشِ ایّام، تو پھر کیا ہوگا

اس محبّت سے سرِ بزم مری سمت نہ دیکھ
ہاتھ سے چھوٹ گیا جام، تو پھر کیا ہوگا

پہلی منزل ہی پہ اقبالؔ یہ دل کا عالم
ایک منزل ہو بہ ہر گام، تو پھر کیا ہوگا

آپ میری طبیعت سے واقف نہیں، مجھ کو بے جا تکلف کی عادت نہیں
مجھ کو پرسش کی پہلے بھی خواہش نہ تھی، اور پرسش کی اب بھی ضرورت نہیں

یوں سرِ راہ بھی پرسشِ حال کی، اس زمانے میں فرصت کسی کو کہاں
آپ سے یہ ملاقات رسمی سہی، اتنی زحمت بھی کچھ کم عنایت نہیں

آپ اس درجہ افسردہ خاطر نہ ہوں، آپ کوئی اثر اپنے دل پر نہ لیں
میں نے جو کچھ کہا اک فسانہ کہا، اور فسانے کی کوئی حقیقت نہیں

ایسی محفل میں شرکت سے کیا فائدہ، ایسے لوگوں سے کوئی توقع بھی کیا
جو کہا جائے خاموش سنتے رہو، لب کُشائی کی قطعاً اجازت نہیں

نکتہ چینی تو فطرت ہے انسان کی، کس کا شکوہ کریں، کس کو الزام دیں
خود ہمیں کون سے پارساؤں میں ہیں، ہم کو دنیا سے کوئی شکایت نہیں

مجھ کو معلوم ہے آپ مجبور ہیں، آپ میرے لئے مفت رسوا نہ ہوں
ایسے حالات میں بے رُخی ٹھیک ہے، مجھ کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں

کچھ یہ اقبالؔ ہی پر نہیں منحصر، سرگرانی مسلط ہے ماحول پر
عقل و دانش کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے، سر اٹھانے کی دنیا کو فرصت کہاں نہیں

○

سب کو پیمانے پہ پیمانہ دیا
مجھ کو اِک اِک بوند کو ترسا دیا

میکدے والوں کی اس میں کیا خطا
ہم کو ساقی نے بڑا دھوکا دیا

دم گھُٹا جاتا ہے اِس ظلمات میں
شوقِ منزل نے کہاں پہنچا دیا

ہم نے اپنی بے محل تدبیر سے
اور بھی تقدیر کو اُلجھا دیا

زندگی کو بے وفا کہتے ہیں ہم
زندگی کو ہم نے لیکن کیا دیا

○

ایک مانوس سی خوشبو ہے فضائیں اب تک
پاس سے اُٹھ کے ابھی کوئی گیا ہو جیسے

رونقِ زیست سے کچھ یوں ہے تعلق مجھ کو
پھول گلشن میں تہِ شاخ پڑا ہو جیسے

آدمی جان کے کھاتا ہے محبت میں فریب
خود فریبی ہی محبّت کا صلہ ہو جیسے

ایک آنسو بھی بہاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
مجھ کو درپردہ کوئی دیکھ رہا ہو جیسے

یوں زمانہ غمِ دوراں سے ڈراتا ہے مجھے
میرے حق میں غمِ دوراں بھی خدا ہو جیسے

○

وجہِ تخریبِ چمن ذہن ہے فرزانے کا
نام بدنام کیا جاتا ہے دیوانے کا

بات تو جب ہے کہ رندوں کا مقدر بدلے
نام تو ہم بھی بدل سکتے تھے میخانے کا

ہر فسانہ ہے محبّت کا مزاجاً یکساں
صرف عنوان بدل جاتا ہے افسانے کا

نشۂ ہونا ہے تو سَو طرح سے ہو سکتا ہے
اس میں کچھ دخل ہے ساقی کا نہ پیمانے کا

کام آتا ہے محبّت میں فقط اپنا خلوص
معتبر ساتھ یگانے کا نہ بیگانے کا

اس کے ہر ریزے میں پوشیدہ ہے غیرت کا وقار
ظرف دیکھے کوئی ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

کم سے کم اُس کی عداوت میں تصنع تو نہیں
دل سے ممنون ہوں اقبالؔ میں بیگانے کا

غنچہ و گُل کے طلسمات، بہاروں کا فریب
تابہ کے کہنہ و فرسودہ سہاروں کا فریب

بارہا ٹوٹا ہے اِس راہ میں پندارِ نظر
پھر بھی کھا جاتا ہے انسان نظاروں کا فریب

اُس کے انجام پہ تقدیر بھی رو دیتی ہے
جب بھی کھا جاتی ہے تدبیر سہاروں کا فریب

اس کے مُجرم ہیں نہ گرداب نہ طوفاں نہ قضا
کھا گیا ڈوبنے والوں کو کناروں کا فریب

جب سہاروں کی ضرورت تھی سہارے نہ ملے
اب دیا جاتا ہے بے وقت سہاروں کا فریب

○

رُخ بدل سکتی ہے تقدیرِ گلستاں اب بھی
جی رہے ہیں ترے کچھ چاک گریباں اب بھی

خاک کے ذرّے بھی دے سکتے ہیں لَو گام بہ گام
اسی ظلمات میں ممکن ہے چراغاں اب بھی

گر چکی ٹوٹ کے تلوار بھی ہاتھوں سے، مگر
حوصلہ وقت سے ہے دست و گریباں اب بھی

صبح کی پہلی کرن لائے گی پیغامِ حیات
اسی زنداں میں ہے اِک روزنِ زنداں اب بھی

ہم حرم والے ہیں اقبالؔ ہمیں مت چھیڑو
سجدہ کرتی ہے ہمیں گردشِ دوراں اب بھی

○

غمِ ماضی سے بھی مانگے گئے کچھ منتخب لمحے
ہوا ہے بے بسی میں اہتمامِ زندگی یوں بھی

چھپانے کو فقط افسردگی دل کی زمانے سے
ہنسی جاتی ہے مجبوری میں اکثر اِک ہنسی یوں بھی

غمِ جاناں بھی دیکھا ہے غمِ دوراں بھی دیکھا ہے
عذابِ زندگی یوں بھی، عذابِ زندگی یوں بھی

یہ پیہم آزمائش کس لئے حُسنِ عقیدت کی
کہ ہے اہلِ وفا کو اعترافِ بندگی یوں بھی

تعلّق بے غرض اقبالؔ جب تک ہو تعلق ہے
کہ ممکن ہے اسی دُنیا میں رسمِ دوستی یوں بھی

○

ہم سے ہر موڑ پہ دُنیا نے عداوت کی ہے
پھر بھی ہم نے اِسی دُنیا سے محبّت کی ہے

یوں شکایت کا تمھیں حق ہے مگر سچ کہنا
ہم نے بھی تم سے کبھی کوئی شکایت کی ہے

ہم کو معلوم ہے اربابِ وفا کا انجام
ہم جہاں دیدہ ہیں ہم نے بھی محبّت کی ہے

دیکھیں کیا مِلتا ہے اِس عرضِ تمنّا کا جواب
ہم نے بھی آج گزارش کی جسارت کی ہے

جس سے گھبراتے ہیں اقبالؔ! زمانے والے
ہم نے کس شوق سے اُس غم کی حفاظت کی ہے

○

دل میں محرومی کا غم، آنکھوں میں نم باقی نہیں
کوئی غم باقی نہیں، اب کوئی غم باقی نہیں

زندگی کی اور ساری تلخیاں باقی سہی
کم سے کم اندیشۂ چشمِ کرم باقی نہیں

حادثے معمول بن کر رہ گئے ہیں اِن دنوں
شکر ہے اب زندگی میں پیچ و خم باقی نہیں

آنکھ مجبورِ تماشا، دل گریزانِ حیات
اب نگاہ و قلب میں ربطِ بہم باقی نہیں

عزمِ منزل کیا کرے کس سمت جائے زندگی
راہ میں اب معتبر نقشِ قدم باقی نہیں

پرسشِ احوال پر کس کس کو دوں کیا کیا جواب
اب وہاں ہوں میں جہاں کوئی الم باقی نہیں

اپنا سب کچھ لُٹ چکا اقبالؔ لیکن شکر ہے
اب کوئی خوفِ زیاں تو کم سے کم باقی ہے، نہیں

○

مجھے لاکھ ہو بھروسہ مرے دل کا کیا ٹھکانا
کبھی بے نقاب ہو کر مرے سامنے نہ آنا

سرِ بزم تم خدارا مجھے یوں نہ آزمانا
مری سمت اس ادا سے کبھی اب نہ مُسکرانا

غمِ زندگی سے ممکن نہ ہوا نباہ میرا
یہ کرم ہے تیرے غم کا مجھے اجنبی نہ جانا

ترے راز کا تحفّظ مرے بس میں اب نہیں ہے
کہ نِکھر کے ہو گئی ہے مری ہر نظر فسانہ

یہ ہنسی، ہنسی نہیں ہے، یہ فریب ہے ہنسی کا
نہ اِسے سمجھ سکے تم، نہ سمجھ سکا زمانہ

کوئی تازہ حادثہ پھر مری راہ تک رہا ہے
مری سمت اُٹھ رہی ہے وہ نگاہِ دلبرانہ

ترے غم کی یادگاریں مرے شعر میری غزلیں
تری اک نظر کا حاصل مرا ذوقِ شاعرانہ

○

یہی آنسو بظاہر بے زباں بھی
یہی آنسو مفصّل داستاں بھی

تبسّم بھی، نگاہِ بدگماں بھی
تخاطب بھی، حجابِ درمیاں بھی

سلیقہ ہو اگر اہلِ قفس میں
یہی کُنجِ قفس ہے آشیاں بھی

یہی دل حسبِ رجحانِ محبّت
دیارِ کعبہ بھی، شہرِ بُتاں بھی

بہاروں کی اِفادت بھی مُسلّم
ضروری ہے مگر جشنِ خزاں بھی

○

جب طبیعت غمِ امروز سے گھبراتی ہے
یادِ ماضی مری پُرسش کو چلی آتی ہے

دل کی جب کوئی دبی چوٹ اُبھر آتی ہے
کتنے بھوُلے ہوئے افسانے سُنا جاتی ہے

تھی یہی زیست کبھی رشکِ بہارِ گلشن
اب اسی زیست پہ رہ رہ کے ہنسی آتی ہے

تلخیٔ زیست کے ہاتھوں ہے یہ عالم اپنا
اب ہنسی ہونٹوں پہ آتے ہوئے شرماتی ہے

جان پہچان نہ ہو جیسے کبھی کی ہم سے
یوں سحر پاس سے ہو ہو کے گزر جاتی ہے

ایک سجدے کی بھی فرصت نہیں مجھ کو اے دوست
یاد بھی تیری دبے پاؤں گزر جاتی ہے

مجھ کو شکوہ نہیں اقبالؔ غمِ دُنیا سے
زندگی اپنی خطاؤں کی سزا پاتی ہے

○

نہ مِنّت کسی کی، نہ شکوہ کسی سے
بسر ہو رہی ہے مگر بے دِلی سے

توقع بھی کیا ہو کسی کو، کسی سے
کہ بے زار ہے آدمی آدمی سے

ملیں تو نگاہیں نگاہوں سے لیکن
ملے جیسے اِک اجنبی اجنبی سے

شکایت کُجا، اور نادم ہوئے ہم
اُٹھائی گئی یوں نظر بے بسی سے

وہ ملنے کو ملتے تو ہیں ہم سے، لیکن
بڑی بے دلی سے، بڑی بے رُخی سے

○

بے لوث محبّت کی ہم نے یہ سزا پائی
غیروں میں بھی رسوائی، اپنوں میں بھی رسوائی

اللہ رے یادوں کی یہ معجزہ فرمائی
ہنستا ہوا غم خانہ، مہکی ہوئی تنہائی

ماضی کے دھندلکوں سے یہ کس کی صدا آئی
ماحول کی رگ رگ میں بجنے لگی شہنائی

نغموں کی کرن پھوٹی مخمور نگاہوں سے
لَو دینے لگے لمحے، لی وقت نے انگڑائی

کچھ تلخ حقایق نے معمول بدل ڈالے
اپنوں سے کم آمیزی، غیروں سے شناسائی

یہ کون سا عالم ہے افسردہ مزاجی کا
گلشن میں بھی ویرانی، محفل میں بھی تنہائی

گلشن کی بہاروں میں شامل ہے لہو جن کا
وہ لوگ ہیں گلشن میں، اب صرف تماشائی

افسردہ چراغوں کی اشکوں نے جگہ لے لی
قسمت سے تلافی کی اک شکل نکل آئی

اقبالؔ جدھر دیکھو ظلمات کے پہرے ہیں
آساں طلبی ہم کو کس موڑ پہ لے آئی

○

گلشن گلشن جشنِ بہاراں فرزانوں کی قسمت میں
صحرا صحرا خارِ مغیلاں دیوانوں کی قسمت میں

جام و سبو سے نظمِ شبستاں ایوانوں کی قسمت میں
خونِ جگر سے سعیِ چراغاں غم خانوں کی قسمت میں

اپنی آگ میں جل بجھنا ہے مسلک شمعِ فروزاں کا
محفل محفل رقصِ شہیداں پروانوں کی قسمت میں

اہلِ خرد کی تقدیروں میں محفل محفل جلوے ہیں
صرف طوافِ کوچۂ جاناں، نادانوں کی قسمت میں

اندھی رسمیں جھوٹے وعدے دیر و حرم کا سرمایہ
عشوۂ ساقی، لغزشِ رنداں میخانوں کی قسمت میں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ تیرگی بُری کیا ہے
جو مِل بھی جائے، تو مانگے کی روشنی کیا ہے

نہ مسکرائیں، نہ آنسو بہیں، نہ ہونٹ ہلیں
یہ زندگی ہے تو پھر اور خودکُشی کیا ہے

میں زندگی کو سہاروں پہ چھوڑ دوں کیسے؟
میں جانتا ہوں، مآلِ سپردگی کیا ہے

ہم اہلِ غم کی ہنسی کو ہنسی کا نام نہ دو
یہ زہرخند کی اک شکل ہے، ہنسی کیا ہے

غزل بہانہ ہے اقبالؔ، لب کُشائی کا
فسانۂ غمِ پنہاں ہے، شاعری کیا ہے

○

کل تک ہماری بات کوئی مانتا نہ تھا
اب سب یہ کہہ رہے ہیں کہ ماضی بُرا نہ تھا

اب اُن کے جی میں کیا ہے ہمیں یہ خبر نہیں
اندازِ گفتگو تو بہت مخلصانہ تھا

پُرسش جو میری آپ نے کی اس کا شکریہ
لہجہ مگر حضور کا کچھ ناقدانہ تھا

ہم کو بیانِ حال کی جرأت نہ ہو سکی
ماحول اُن کے گھر کا بہت شاعرانہ تھا

ہجرت کو ہم نے منزلِ آخر سمجھ لیا
ورنہ یہ فیصلہ بھی غلط فیصلہ نہ تھا

اب اس کا کیا علاج کہ ہم خود ہیں گُل فروش
ورنہ اِسی چمن کے مُقدّر میں کیا نہ تھا

کل میکدے میں سب سے ملاقات ہو گئی
معلوم یہ ہوا کہ کوئی پارسا نہ تھا

○

شکایتیں ہوئیں، پُرسشِ ہوئی، سلام ہوئے
نظر، نظر سے ملی تو بہت سے کام ہوئے

روا روی میں بھلا اُن سے بات کیا ہوتی
وہ مُلتفت بھی ہوئے تو برائے نام ہوئے

جواب جب بھی ملا ہم کو بے رُخی سے ملا
سلام اب نہیں ہوں گے، بہت سلام ہوئے

تمھاری باتوں میں تلخی سہی، غرور سہی
یہی بہت ہے کہ تم مجُھ سے ہم کلام ہوئے

بہار ہم کو میسّر نہ ہو سکی اقبالؔ
ہزار بار بہاروں کے اہتمام ہوئے

○

تمھاری یاد مری زندگی ہے، یہ تسلیم
مگر میں چاہوں تو تم کو بھُلا بھی سکتا ہوں

تمھارا غم مرے حق میں چراغِ راہ سہی
میں اس چراغ کو ضد میں بجھا بھی سکتا ہوں

یہ تیرگی مری دیرینہ دوست ہے ورنہ
میں اپنے گھر کے دِیے پھر جلا بھی سکتا ہوں

میں کیا کروں مجھے ویرانیوں سے عشق سا ہے
خزاں کو ورنہ بہاراں بنا بھی سکتا ہوں

زباں پہ لانے کی ہر بات گو نہیں ہوتی
بضد ہو تم، تو یہ تُہمت اُٹھا بھی سکتا ہوں

سُنے بغیر نہ سمجھے تو سُن کے کیا ہوگا
کہو تو ویسے فسانہ سُنا بھی سکتا ہوں

بایں فسُردہ دلی اپنے دوستوں کے لئے
غزل کے ساز پہ نغمہ سُنا بھی سکتا ہوں

جاں نثاروں سے تغافل آپ کا دستور ہے
جانے کیوں یہ بات سارے شہر میں مشہور ہے

کون ہے جو عشق کے انجام سے واقف نہیں
آدمی اپنی طبیعت سے مگر مجبور ہے

یہ تو ہم بھی جانتے ہیں دُور ہے منزل ابھی
بس کوئی اتنا بتا دے اور کتنی دُور ہے

مجھ کو اُن کی برہمی پر کوئی حیرت ہے نہ غم
دوستی میں رنجشیں ہوتی ہیں یہ دستور ہے

تم ذرا اقبالؔ سے مل کر تو دیکھو ایک بار
جانے کس نے کہہ دیا تم سے کہ وہ مغرور ہے

○

اِک وفا دشمن کو بھی اپنا بنا لینا پڑا
یہ فریبِ زندگی، دانستہ کھا لینا پڑا

ہائے مجبوری کہ اوروں کی خوشی کے واسطے
اپنا دامن اُن کے ہاتھوں سے چھُڑا لینا پڑا

مُلتجی نظروں سے یوں دیکھا گیا میری طرف
ہر شکایت کو تبسّم میں چھُپا لینا پڑا

اپنی خود داری کے ہاتھوں ہو گئے مجبور ہم
گُل کو کانٹا جان کے، دامن بچا لینا پڑا

بارہا اقبالؔ عزمِ جستجو کے سامنے
حادثاتِ زندگی کو سر جھُکا لینا پڑا

○

دل میں کوئی خلش ہے نہ آنکھوں میں نم ابھی
ہے اپنے اختیار میں احساسِ غم ابھی

ساحل کی بات بعد میں ہو گی ابھی نہیں
طوفانِ زندگی سے مخاطب ہیں ہم ابھی

کچھ لوگ منزلوں سے بھی آگے نکل گئے
کچھ لوگ ڈھونڈھتے ہیں نقوشِ قدم ابھی

تاریخِ غم ہنوز مکمل نہیں ہوئی
ہوں گے نہ جانے کتنے فسانے رقم ابھی

فی الحال دشمنوں کی ضرورت نہیں ہمیں
کافی ہیں دوستوں کے خصوصی کرم ابھی

مجبور ہو کے ٹوٹ گئے حادثے تمام
ہونے نہ پائی تھیں مری پلکیں بھی نم ابھی

اقبالؔ اب بھی زندہ ہیں کچھ سرفروش لوگ
روشن رہے گا یوں ہی چراغِ حرم ابھی

○

ہنسنا نہیں آتا مجھے، یہ بات نہیں ہے
شاید تمھیں اندازۂ حالات نہیں ہے

یہ کیسے کہوں اُن سے میں واقف ہی نہیں ہوں
ہاں دُور سے دیکھا ہے، ملاقات نہیں ہے

شکوے تو اُنھیں مجھ سے، ہمیشہ ہی رہیں گے
میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے

یوں اُن سے ملاقات تو ہو جاتی ہے اکثر
بس سلسلۂ پرسشِ حالات نہیں ہے

ناموسِ محبّت کا تحفّظ، ہے بڑی بات
خود اپنا زیاں، کوئی بڑی بات نہیں ہے

بے نُور اُجالوں کو سحر کیسے سمجھ لوں؟
تم لاکھ کہے جاؤ کہ اب رات نہیں ہے

اقبالؔ، بُرا کہتے ہو، تم دل شکنی کو
اِس دَور میں یہ بات، کوئی بات نہیں ہے

○

اب مجھ سے مخاطب نگہِ کم بھی نہیں ہے
یوں ہی سہی، اب دل کا وہ عالم بھی نہیں ہے

مافات کا ماتم بھی ہے، حالات کا غم بھی
لیکن بخدا آنکھ ابھی نم بھی نہیں ہے

تم بھول گئے مجھ کو، یہ اچھا کیا تم نے
اِس ترکِ تعلق کا مجھے غم بھی نہیں ہے

جو اب ہیں وہ حالات گوارا تو نہیں ہیں
گزرے ہوئے لمحوں کا مگر غم بھی نہیں ہے

یہ بات الگ ہے کہ ہنسی اب نہیں آتی
لیکن مجھے اب فرصتِ ماتم بھی نہیں ہے

○

وہ روٹھ جائیں گے اس طرح بے سبب مجھ سے
مجھے خبر نہ تھی احساسِ زندگی کی قسم

میں اپنے غم سے بھی ہوں مطمئن خدا شاہد
جو مجھ سے روٹھ چکی ہے اُسی خوشی کی قسم

جو تیری یاد میں ٹپکا وہ اشک حاصلِ غم
جو اب نہ آئے گی ہونٹوں پہ اُس ہنسی کی قسم

تری تلاش میں گُم ہو کے پا گیا سب کچھ
جو مجھ کو راس نہ آئی اُس آگہی کی قسم

مری نگاہ کو اب بھی ہے تابِ نظّارہ
نقاب اُٹھا تجھے دل کی شکستگی کی قسم

فریب دیدہ و دانستہ کھا رہا ہوں میں
تری نگاہ کی معصوم سادگی کی قسم

یہ تو نے کیوں مجھے بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
میں اپنے حال میں خوش تھا تری خوشی کی قسم

○

مشفق ملے، شفیق ملے، مہرباں ملے
دل جس کو ڈھونڈھتا ہے وہ دیکھیں کہاں ملے

تنہائی ہر قدم پہ مری ہم سفر رہی
مِلنے کو راستے میں کئی کارواں ملے

اُن سے بیانِ حال کی جرأت نہ ہو سکی
کچھ ایسی بے رُخی سے ملے وہ جہاں ملے

جورِ فلک کی ہم کو ضرورت نہیں پڑی
ہم کو اسی زمین پہ سو آسماں ملے

پندارِ شوق ان سے مخاطب نہیں ہوا
رستے میں ہر قدم پہ کئی آستاں ملے

تلخیٔ زیست کو ہنس ہنس کے بُھلا رکھا ہے
ہم نے ہر زخم کو سینے سے لگا رکھا ہے

غم کے احساس پہ ڈالی ہے تبسّم کی نقاب
تا بمقدور ترا راز چھُپا رکھا ہے

نہ مجھے غم سے شکایت، نہ وجہِ غم سے
مجھ کو غمخواروں نے دیوانہ بنا رکھا ہے

ایک موہوم سی امّید ہے توجیہِ حیات
اک دِیا زد پہ ہواؤں کی جلا رکھا ہے

عرضِ احوال بھی ہے پُرسشِ احوال بھی ہے
غم کو غم والوں نے افسانہ بنا رکھا ہے

○

خفا خفا سا ہے احساسِ زندگی اے دوست
ترے بدلتے ہی دُنیا بدل گئی اے دوست

لُٹی لُٹی سی بہاریں، گھُٹا گھُٹا سا چمن
نہ جانے کیوں ہے فسُردہ کلی کلی اے دوست

اس انجمن میں کہ آباد تھی ترے دم سے
بُجھی بُجھی ہے چراغوں کی روشنی اے دوست

جہاں چھُٹا تھا مرے ہاتھ سے ترا دامن
بھٹک رہی ہے وہیں اب بھی زندگی اے دوست

ہنسی کی اوٹ میں آنسو چھُپا رہا ہوں میں
سمجھ سکے تو سمجھ میری بے بسی اے دوست

تری خوشی سے عبارت تھی جب خوشی میری
ابھی ہے یاد وہ دورِ سُپردگی اے دوست

اگرچہ ختم ہوئی داستانِ پارینہ
تُو ہی ہے آج بھی عنوانِ زندگی اے دوست

○

باغ و بہار بن کر وہ انجمن میں آئے
اب جس میں حوصلہ ہو اُن سے نظر ملائے

کانٹوں سے بچ کے شاید کوئی گزر بھی جائے
پھولوں سے اپنا دامن کیسے کوئی بچائے

ملتے ہی آنکھ، آنسو پلکوں پہ جھلملائے
اظہارِ غم کی جرأت کوئی کہاں سے لائے

اُمید کر رہی ہے پھر راہ میں چراغاں
پھر جستجوئے منزل دھوکے میں آ نہ جائے

جو راز ماحصل ہے پندارِ آرزو کا
وہ راز ڈر رہا ہوں پلکوں تک آ نہ جائے

آنکھیں بھی مُنتظر ہیں سجدے بھی مُنتظر ہیں
بیٹھے ہیں دیر سے ہم یہ انجمن سجائے

ہنسنے کو جی نہ چاہے ہنسنا مگر ضروری
ہم ایسی زندگی سے اقبالؔ باز آئے

○

زندگی، کہنے کو، فردوسِ نظر گزری ہے
دل سے پوچھے کوئی، جس طرح مگر گزری ہے

میں گھرا بیٹھا ہوں ماحول کی تاریکی میں
گو اِسی راہ سے سو بار سحر گزری ہے

یوں بھی گزری ہے غریب الوطنی میں اکثر
رات تو رات ہے، مشکل سے سحر گزری ہے

رونقِ زیست بھی گزری ہے انھیں راہوں سے
دُور ہی دُور سے گزری ہے، مگر گزری ہے

چاند، تاروں کو بھی رشک آیا ہے قسمت پہ مری
یوں بھی اک رات، کبھی تا بہ سحر گزری ہے

○

فریبِ خندۂ پیہم کسی کو کیا معلوم
بپا ہے دل میں جو ماتم کسی کو کیا معلوم

میں ہنس رہا ہوں بظاہر، مگر مرے دل پر
گزر رہا ہے جو عالم کسی کو کیا معلوم

بیانِ حال بصد احتیاط ہے منظور
رموزِ گریۂ کم کم کسی کو کیا معلوم

لبوں تک آ کے چھلک جائیں جس سے پیمانے
اُس اک نگاہ کا عالم کسی کو کیا معلوم

یہ حُسنِ سادہ و معصوم ہے نظر کا فریب
مزاجِ گیسوئے برہم کسی کو کیا معلوم

چمن کے لوگ فدا ہیں تبسّمِ گُل پر
پیامِ گریۂ شبنم کسی کو کیا معلوم

اِسی پہ دامنِ رحمت کو ناز ہے اقبالؔ
مقامِ دیدۂ پُرنم کسی کو کیا معلوم

○

گلشن سے دُور دُور بہاروں سے دُور دُور
جینا پڑا تمام سہاروں سے دُور دُور

یوں بڑھ رہی ہے کشتیِ عُمرِ رواں مری
موجوں کے ساتھ ساتھ کناروں سے دُور دُور

اکثر رہِ حیات سے گزری ہیں رونقیں
لیکن غمِ حیات کے ماروں سے دُور دُور

کس عافیت سے وقت گزرتا ہے اِن دنوں
اِن ظلمتوں میں، چاند ستاروں سے دُور دُور

گزرا ہوں میں چمن سے بھی اقبالؔ بارہا
لیکن خطا معاف، بہاروں سے دُور دُور

○

یہ نم فضا، یہ گھٹائیں، یہ شام اے ساقی
بہ شرطِ ہوش پھر اک دورِ جام اے ساقی

میں لاکھ تشنہ لب و تشنہ کام اے ساقی
سوال پھر بھی ہے مجھ پر حرام اے ساقی

پھر ایک جلوہ بصد اہتمام اے ساقی
نظر بہ پردہ ہے عالم تمام اے ساقی

جو التفات کی اِک شکل ہے تغافل بھی
تو التفات کو میرا سلام اے ساقی

یہ جامِ مے، یہ تبسّم، یہ چشمِ کیف آگیں
فریب، اور بہ ایں اہتمام اے ساقی

بہ ایں تغافلِ پیہم مری طلب کے لئے
تری نظر میں ہے اب بھی پیام اے ساقی

ترے وقار کی ضامن عقیدتِ اقبالؔ
مرے وقار کا بھی احترام اے ساقی

یہ نگاہِ حُسن جُھکی جُھکی، یہ جبینِ ناز دھواں دھواں
مرے بس کی اب نہیں داستاں، مرا کانپتا ہے رُواں رُواں

ہو طلسمِ عالمِ رنگ و بُو، کہ حریمِ انجم و کہکشاں
مرا ساتھ دے گی نظر مری، وہ چُھپیں گے جا کے جہاں جہاں

مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ یہ احتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں، وہ خلوص و ربط نہاں نہاں

نہ سفر بہ شرطِ مآل ہے، نہ طلب بہ قیدِ سوال ہے
فقط ایک سیریٔ ذوق کو، میں بھٹک رہا ہوں کہاں کہاں

مری خلوتوں کی یہ جنّتیں کئی بار سج کے اُجڑ چکیں
مجھے بارہا یہ ہوا گماں کہ تم آ رہے ہو کشاں کشاں

ہیں ہنوز یاد وہ قُربتیں، وہ نیاز و ناز، وہ صحبتیں
وہ طلوعِ صبحِ خُنک خُنک، وہ فضائے شامِ جواں جواں

یہ تخیّلات کی زندگی، یہ تصوّرات کی بندگی
فقط اک فریبِ خیال پر مری زندگی ہے رواں دواں

○

دل کی دھڑکن کوئی در پردہ اشارہ تو نہیں
راز دارانہ کہیں اُس نے پکارا تو نہیں

یہ جو پلکوں سے ابھی ٹوٹ کے دامن پہ گرا
میری ڈوبی ہوئی قسمت کا ستارا تو نہیں

آرزو تیری مجھے جو بھی دکھا دے، منظور
ورنہ اب زیست کا احسان گوارا تو نہیں

مجھ کو دشوارئِ منزل سے ڈرانے والو!
حاصلِ شوق تلاطم ہے، کنارا تو نہیں

زندگی وقفِ غمِ دوست تو کردوں اقبالؔ
زندگی کا بھی مگر کوئی سہارا تو نہیں

O

لطف و نشاطِ خندۂ پیہم کچھ اور ہے
کیف و سرورِ گریۂ کم کم کچھ اور ہے

گلشن حسین، اس کی بہاریں حسین تر
لیکن تری نگاہ کا عالَم کچھ اور ہے

دل رو رہا ہے اور تبسّم لبوں پہ ہے
اس بزم میں سلیقۂ ماتم کچھ اور ہے

گزرے جو تیرے ساتھ وہ لمحے بھی یاد ہیں
لیکن ترے فراق کا عالَم کچھ اور ہے

ہر غنچۂ چمن کا تبسّم حیاتِ نو
لیکن پیامِ گریۂ شبنم کچھ اور ہے

جلتے ہوئے چراغ کا عالَم کچھ اور تھا
بُجھتے ہوئے چراغ کا عالَم کچھ اور تھا

اقبالؔ اور آئے گا جینے میں اب مزہ
نظمِ حیات درہم و برہم کچھ اور ہے

○

ہمیں یہ کیوں ہیں عتابات کوئی کیا جانے
تری نظر کے کنایات کوئی کیا جانے

نگاہِ وقت ہے خود اپنی نیند سے بوجھل
کسی کی کیسے کٹی رات کوئی کیا جانے

جو بامراد ہیں وہ خوش نصیب ہیں، لیکن
شکستِ دل کے مقامات کوئی کیا جانے

یہ روٹھ جائے تو کھل جائے رازِ میخانہ
مقامِ رندِ خرابات کوئی کیا جانے

جھکی رہی جو سرِ بزم رات دانستہ
اُس اک نظر کے پیامات کوئی کیا جانے

نگاہِ لطف بھی دل پر گراں گزرتی ہے
ستم ظریفیٔ حالات کوئی کیا جانے

نظر کا کام ہے اقبالِ انتظار، مگر
اُٹھیں گے کب یہ حجابات کوئی کیا جانے

تم نغمۂ ماہ و انجم ہو، تم سوزِ تمنّا کیا جانو
تم دردِ محبّت کیا سمجھو، تم دل کا تڑپنا کیا جانو

کب درد بڑھا کب ہوک اُٹھی، کیوں اشک بہا کیوں آہ کھچی
تم گُم ہو بہاروں میں اپنی، تم غم کا فسانہ کیا جانو

اک موجِ تبسّم ہونٹوں پر، اک نغمۂ رنگیں آنکھوں میں
تم رقصِ ثریّا کیا سمجھو، تم بربطِ زہرا کیا جانو

تم رُوٹھ گئے جب جب ہم سے، ہم تم کو منا ہی لیتے تھے
اک بار اگر ہم رُوٹھ گئے، تم ہم کو منانا کیا جانو

تخریبِ محبّت آساں ہے، تعمیرِ محبّت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بُجھانا کیا جانو

تم دُور کھڑے دیکھا ہی کیے اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
ساحل ہی کو تم منزل سمجھے، تم لذّتِ دریا کیا جانو

تم حُسنِ سراپا اپنی جگہ، اور حُسنِ سراپا خودداری
اقبالؔ کا غم تم کیوں سمجھو، اور اُس کا دلاسا کیا جانو

ملنے میں احتیاط بھی، آنکھوں میں کچھ پیام بھی
ضبط کا التزام بھی، ربط کا اہتمام بھی

لاکھوں چراغ جل گئے ساری فضا میں دُور تک
بھُولے سے آگیا ہے جب ہونٹوں پہ تیرا نام بھی

جرمِ وفا کے مرتکب، چشمِ کرم کے منتظر
آج شریکِ بزم ہیں آپ کے کچھ غلام بھی

آج مزاجِ زندگی نام ہے، اِک تضاد کا
خندہ لبی کا حکم بھی، خندہ لبی حرام بھی

ساری نزاکتوں کا حل ایک تصوّرِ حسیں
آپ سے دُور دُور بھی، آپ سے ہم کلام بھی

○

اِدھر احتیاطِ پیہم، اُدھر اجتنابِ محکم
نہ میں کہہ سکا کہانی، نہ وہ سُن سکے کہانی

مجھے آپ سے گِلہ ہے تو فقط یہی گِلہ ہے
مری بات اپنی ضِد میں کبھی آپ نے نہ مانی

ابھی ابتدا ہی کی ہے ابھی آپ نے سُنا کیا
جو ابھی سے نم ہیں پلکیں تو میں کہہ چکا کہانی

غمِ زندگی سے مجھ کو کوئی خوف اب نہیں ہے
ترے غم سے ہو رہی ہے مرے دل کی پاسبانی

مجھے علم ہے بخوبی کہ تمھارے دل میں کیا ہے
مجھے تم نہ دے سکو گے یہ فریبِ بدگمانی

○

پیمانے چھلک ہی جاتے ہیں جب کیف کا عالم ہوتا ہے
یہ راز زمانہ کیا جانے، کیوں گریۂ کم کم ہوتا ہے

اب سعیٔ تلافی لاحاصل، اب کوششِ درماں بے معنی
جو درد مُقدّر بن جائے، وہ درد کہاں کم ہوتا ہے

اُس وعدہ شکن کے بھولے پن پر کوئی خفا بھی کیسے ہو
اقرار بھی مبہم ہوتا ہے، انکار بھی مبہم ہوتا ہے

انجامِ بہاراں کے ڈر سے پھولوں کو پسینے آتے ہیں
وہ خونِ جگر ہے گلشن کا جو قطرۂ شبنم ہوتا ہے

سچ مُچ کی خوشی ملتی ہے کسے اِس آہ و بُکا کی دُنیا میں
ہم جس کو تبسّم کہتے ہیں سوچو تو وہ ماتم ہوتا ہے

○

یہ نرم و خنک شام، یہ شاداب نظارے
گزرے ہوئے لمحات کے مانوس اشارے

پلکوں پہ نمودار ہوئے چند ستارے
جیسے کسی مجبور کے کمزور سہارے

طوفان کناروں سے ابھی دُور ہے، لیکن
طوفان سے محفوظ نہیں ہیں یہ کنارے

یہ رنگ، یہ رونق، یہ پھبن سحرِ نظر ہے
ہر پھول کے سینے میں فروزاں ہیں شرارے

تقدیر سے اُٹھ جاتے ہیں جب دل کے اُجالے
کام آتے ہیں ایسے میں چراغاں نہ ستارے

دامن غمِ ماضی سے کوئی کیسے بچائے
ہر نقش اُبھر آتا ہے یادوں کے سہارے

اقبالؔ یہ آنسو نہ تلافی نہ مداوا
تقدیر کو روتے رہیں تقدیر کے مارے

○

کیا جانے انھیں ہم کیا سمجھے، جو اُن پہ بھروسا کر بیٹھے
امّید کے جھوٹے وعدے پر دل نذرِ تمنّا کر بیٹھے

سب کھو کے بھی ہم کچھ پا نہ سکے، وہ ہم سے الگ ہم اُن سے الگ
دُنیا جسے دیکھے اور ہنسے، ہم ایسا تماشا کر بیٹھے

وہ درد نہیں، وہ ہُوک نہیں، وہ اشک نہیں، وہ آہ نہیں
گُل کر کے چراغوں کو اپنے ہم گھر میں اندھیرا کر بیٹھے

ہم شوق کے ہاتھوں بے بس ہیں، انجامِ سفر تو ظاہر ہے
اب جان پہ بنتی ہے تو بنے، منزل کا ارادہ کر بیٹھے

اک برق سی جیسے کوند گئی، چٹکی جو کلی گلشن میں کہیں
جب اتنی بھی دل میں تاب نہیں، کیوں ضبط کا دعویٰ کر بیٹھے

انجام کی لذّت یاد رہی، آغاز کی شدّت بھول گئے
ساحل کے چھلاوے میں آکر موجوں پہ بھروسا کر بیٹھے

جس آس سے دھڑکن تھی دل میں، جس آس سے نبضیں چلتی تھیں
وہ آس بھی قسمت چھین چکی، ہم یہ بھی گوارا کر بیٹھے

○

جستہ جستہ ان کو اقرارِ وفا ہونے لگا
تحفۂ غم اب تو بے مانگے عطا ہونے لگا

اب جبینِ شوق حائل ہے نہ سنگِ آستاں
آنکھوں ہی آنکھوں میں اب سجدہ ادا ہونے لگا

ایک میخانہ بچا تھا عاصیوں کے واسطے
سو وہاں بھی دخلِ زُہد و اِتّقا ہونے لگا

شکوہ اور میری زباں سے؟ وہ بھی کس کا، آپ کا؟
آپ کو اب جاں نثاروں سے گِلہ ہونے لگا!

دل کے بھولے پن پہ خود مجھ کو بھی آتی ہے ہنسی
اک ذرا آہٹ ہوئی، سجدہ ادا ہونے لگا

○

لرز رہا ہوں میں احساسِ قُربِ منزل سے
سفینے ڈوب بھی جاتے ہیں مِل کے ساحل سے

میں آہ کر کے نتائج پہ غور کرتا ہوں
نکل نہ آئے کوئی بے نقاب محمل سے

پھر اُس کے بعد جہاں میں کہیں اماں نہ ملی
ہم اُٹھ تو آئے خفا ہو کے تیری محفل سے

عذابِ موج و تلاطم مجھے قبول، مگر
خدا بچائے عذابِ فریبِ ساحل سے

کچھ اور بڑھ گئی دل کی فُسردگی اقبالؔ
کیا کسی نے تبسّم نہ جانے کِس دل سے

○

بفکرِ زیست ذوقِ بندگی کیا
محبّت میں سوالِ زندگی کیا

کبھی ہنس بھی دیے تو بے ارادہ
ہم آشفتہ مزاجوں کی ہنسی کیا

مرا ذوقِ نظر ہے کارفرما
تری محفل کی ورنہ روشنی کیا

قفس کی زندگی تو خیر معلوم
چمن کی زندگی بھی زندگی کیا

جو اپنے تھے وہی جب چھوڑ بیٹھے
کسی سے شکوۂ بیگانگی کیا

قفس کو کوئی پھولوں سے سجائے بھی تو کیا ہوگا
حقیقت کوئی پردوں میں چھپائے بھی تو کیا ہوگا

ہمارے غمکدے تک روشنی پہنچے تو ہم جانیں
ستارے آسماں پر جگمگائے بھی تو کیا ہوگا

نہ جانے کب سے سچ مچ کی ہنسی کو جی ترستا ہے
جو دل پر جبر کر کے مسکرائے بھی تو کیا ہوگا

چمن والوں نے کوئی تار دامن میں نہیں چھوڑا
کوئی کانٹوں سے اب دامن بچائے بھی تو کیا ہوگا

جہاں ہر بات ٹالی جائے بامعنی تبسم سے
وہاں رُوداد غم کوئی سنائے بھی تو کیا ہوگا

رَبَابُ

○

میں شگفتہ لبِ اظہار کہاں سے لاؤں
عشق و رومان کے اذکار کہاں سے لاؤں

قصۂ تلخئ دوراں میں سُنا سکتا ہوں
داستانِ لب و رخسار کہاں سے لاؤں

اپنے احساس سے میں جھوٹ کہاں تک بولوں
شعر میں شوخئ افکار کہاں سے لاؤں

میں غزل گو ہوں قصیدہ تو نہیں کہہ سکتا
کیا کروں لہجۂ دربار کہاں سے لاؤں

آپ کے شہر میں رونق تو بہت ہے لیکن
اپنے گھر کے در و دیوار کہاں سے لاؤں

صوت و الفاظ کی ضربت پہ بھروسہ ہے مجھے
میں تہی دست ہوں تلوار کہاں سے لاؤں

میں تو بِک سکتا ہوں صرف ایک تبسّم کے عوض
لیکن اب ایسے خریدار کہاں سے لاؤں

غم زدہ لوگ تو مِل سکتے ہیں جتنے چاہو
آج کے دَور میں غم خوار کہاں سے لاؤں

مجھ کو معلوم ہے میں جنسِ گراں ہوں اقبالؔ
لیکن اب مصر کا بازار کہاں سے لاؤں

○

ضبط بھی چاہیے، ظرف بھی چاہیے اور محتاط پاسِ وفا چاہیے
زندگی دشمنوں میں بھی مشکل نہیں، آدمی میں ذرا حوصلہ چاہیے

ہم کو منزل شناسی پہ بھی ناز ہے اور ہم آشنائے حوادث بھی ہیں
جوئے خوں سے گزرنا پڑے بھی تو کیا، جستجو کو تو اک راستہ چاہیے

اپنے ماتھے پہ بل ڈال کر تم ہمیں شیش محلوں کے اندر سے جھڑکی نہ دو
ہم بھکاری نہیں ہیں کہ ٹل جائیں گے، ہم کو اپنی وفا کا صلہ چاہیے

تم نے آرائشِ گلستاں کے لئے، ہم سے کچھ خون مانگا تھا مدت ہوئی
تم سے خیرات تو ہم نہیں مانگتے، ہم کو اس خون کا خوں بہا چاہیے

میری مانو تو اک بات تم سے کہوں، یہ نیا دَور ہے اس کا کیا ٹھیک ہے
دوستوں سے ملو محفلوں میں مگر، آستینوں کا بھی جائزہ چاہیے

حد سے بڑھ کر محبت مناسب نہیں، اس میں اندیشۂ بدگمانی بھی ہے
دشمنوں سے تعلق تو ہے ہی غلط، دوستوں میں بھی کچھ فاصلہ چاہیے

ہم کو ہر موڑ پر دوست ملتے رہے، ہم کبھی راہِ منزل میں تنہا نہ تھے
کل غمِ دوست تھا، اب غمِ زیست ہے، آشنا کو تو اک آشنا چاہیے

قفلِ زنداں اگر تم نہیں کھولتے، کم سے کم لب کُشائی کی مہلت تو دو
ہم نوا گر ہیں کوئی گداگر نہیں، ہم اسیروں کو اذنِ نوا چاہیے

جُرمِ بے باک گوئی کی پاداش میں زہر اقبالؔ کو زندگی نے دیا
اُس نے اُس زہر کو بھی سخن کر لیا، اِس زمانے کو اب اور کیا چاہیے

○

خطا معاف، یہ کچھ اور ہے حیا تو نہیں
کہیں یہ ترکِ تعلق کی ابتدا تو نہیں

یہ بات الگ ہے کہ آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے
مگر زباں سے کبھی ہم نے کچھ کہا تو نہیں

خطا تو جب ہو کہ ہم عرضِ مدعا بھی کریں
کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

جو بات دل میں ہے بے خوف کیوں نہیں کہتے
زبان و قلب میں کچھ ایسا فاصلہ تو نہیں

نصیب کیسے بدل دے کوئی سفینے کا
جو ناخدا ہے وہ سب کچھ سہی خدا تو نہیں

میں ان کی بات کا کوئی اثر نہیں لیتا
مرے عدو کہیں اس بات پر خفا تو نہیں

ابھی سے اس کے نتائج کا تجزیہ نہ کرو
یہ ابتدا ہے مسافت کی، انتہا تو نہیں

نہ جانے قافلے والے خفا ہیں کیوں مجھ سے
میں صرف ایک مسافر ہوں، رہنما تو نہیں

حضور! آپ نے اقبال کو غلط سمجھا
وہ پارسا ہے مگر آدمی بُرا تو نہیں

○

شہر کا شہر جب دہائی دے
کوئی فریاد کیا سُنائی دے

کوئی کیسے کسی کو پہچانے
روشنی ہو تو کچھ دکھائی دے

کم سے کم اتنی روشنی یا رب!
ہاتھ کو ہاتھ تو سُجھائی دے

مجھ کو کرنا ہے زندگی سے نباہ
مجھ کو تھوڑی سی بے وفائی دے

بد دعائیں نہ سُن سکوں گا میں
مجھ کو شاہی نہ دے، گدائی دے

لفظ پابندِ مصلحت ہیں ہنوز
ان کو اس قید سے رہائی دے

ضبط اب میرے بس کی بات نہیں
مجھ کو بھی اِذنِ لب کشائی دے

لے سکوں دشمنوں سے درسِ خلوص
مجھ کو وہ ظرف آشنائی دے

جن کے دل کھو چکے ہوں بینائی
ان کو آنکھوں سے کیا دکھائی دے

عاجزی میری خوٗ نہ بن جائے
مجھ کو توفیقِ خود نمائی دے

○

نئے خداؤں سے مشروط دوستی کرلی
فقیہِ شہر نے تجدیدِ بندگی کرلی

وہ بدنصیب جسے سب ضمیر کہتے تھے
سُنا ہے اس نے کہیں چھپ کے خودکشی کرلی

اسے خلوص کہو یا ہماری نادانی
جو کوئی ہنس کے مِلا اس سے دوستی کرلی

مَبادا کوئی فرشتہ ہمیں سمجھ بیٹھے
خطا بھی جان کے ہم نے کبھی کبھی کرلی

چراغ سب نے جلائے تو ان کی خاطر سے
ذرا سی دیر کو ہم نے بھی روشنی کرلی

بہارِ صحنِ چمن تک نہ جانے کب پہنچے
خزاں سے ہم نے سرِ دست دوستی کرلی

کوئی بتائے کہ منزل کا کیا قصور اقبالؔ
ہمیں نے راہ میں دیوار خود کھڑی کرلی

○

ہونٹوں پہ تمھارے جو کوئی مُہر لگا دے
تعریف تو جب ہے کہ خموشی بھی صدا دے

اس دَور میں جینے کا اُسے حق بھی نہیں ہے
جو شخص تہِ تیغ بھی قاتل کو دعا دے

کچھ ایسے طرحدار بھی زندہ ہیں ابھی تک
مقتل بھی جنھیں کوچۂ جاناں کا مزہ دے

دیوارِ سرِراہ کے شاکی تو سبھی ہیں
کوئی نہیں جو بڑھ کے یہ دیوار گرا دے

جس گھر کو مُیسّر نہ ہو مٹّی کا دیا بھی
اُس گھر کو تو بہتر ہے کوئی آگ لگا دے

ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے

وہ لوگ جنھیں پاسِ شریعت بھی نہیں ہے
پہنے ہوئے بیٹھے ہیں مشیخت کے لبادے

رہزن ہو کہ رہبر کوئی اب ان سے نہ الجھے
کچھ اور ہیں اب قافلے والوں کے ارادے

اقبالؔ میں ہر حال میں راضی برضا ہوں
سب اُس کی عطا ہے وہ جزا دے کہ سزا دے

لاکھ میں سب سے خفا ہو کے چلا تھا گھر سے
میرا رشتہ کسی منزل پہ نہ ٹوٹا گھر سے

پوری رُوداد سفر تو ہمیں اب یاد نہیں
وہ گھڑی یاد ہے جب کوچ کیا تھا گھر سے

لوٹنے والوں نے ہر فکر سے آزاد کیا
گھر کھلا چھوڑ کے ہم چل دئے تنہا گھر سے

ہم نے ہر طاق میں اک شمع جلا کر دیکھی
پھر بھی رخصت نہ ہوا گھر کا اندھیرا گھر سے

غم کی توہین تھی ساقی کا سہارا لینا
ورنہ میخانہ بہت دُور نہیں تھا گھر سے

اِس طرح ایک نیا شہر ہوا ہے آباد
ربطِ ہمسائیگی باقی نہیں گھر کا گھر سے

(ق)

پاس کے گھر میں کوئی رات بہت روتا تھا
ہم نے آواز بھی دی کوئی نہ نکلا گھر سے

اب تو جیسے بھی ہو اقبالؔ گزارا کر لو
کوئی کیا آئے گا جب خط بھی نہ آیا گھر سے

○

یہ مری انا کی شکست ہے، نہ دوا کرو نہ دعا کرو
جو کرو تو بس یہ کرم کرو مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو

وہ جو ایک ترکشِ وقت ہے ابھی اُس میں تیر بہت سے ہیں
کوئی تیر تم کو نہ آ لگے مرے زخمِ دل پہ نہ یوں ہنسو

نہ میں کوہکن ہوں، نہ قیس ہوں، مجھے اپنی جان عزیز ہے
مجھے ترکِ عشق قبول ہے، جو تمہیں یقینِ وفا نہ ہو

جو تمہارے دل میں شکوک ہیں تو یہ عہد نامے فضول ہیں
جو مرے خطوط ہیں پھاڑ دو، یہ تمہارے خط ہیں سمیٹ لو

جو کسی کو کوئی ستائے گا تو گلہ بھی ہونٹوں تک آئے گا
یہ تو اک اصول کی بات ہے، جو خفا ہے مجھ سے کوئی تو ہو

مجھے اب صداؤں سے کام ہے، مجھے حالِ خد کی خبر نہیں
تو پھر اس فریب بے فائدہ یہ نقاب اب تو اُتار دو

مجھے اپنے فقر پہ ناز ہے، مجھے اس کرم کی طلب نہیں
میں گدا نہیں ہوں فقیر ہوں، یہ کرم گداؤں میں بانٹ دو

یہ فقط تمھارے سوال کا مرا مختصر سا جواب ہے
یہ گلہ نہیں ہے، خلوص ہے، مری گفتگو کا اثر نہ لو

یہ ادھورے چاند کی چاندنی بھی اندھیری رات میں کم نہیں
کہیں یہ بھی ساتھ نہ چھوڑ دے، ابھی روشنی ہے چلے چلو

ہمیں جن دوستوں نے بے گناہی کی سزا دی ہے
ہمارا ظرف دیکھو ہم نے ان کو بھی دعا دی ہے

مبادا مُہرِ خاموشی لگادی جائے ہونٹوں پر
غزل کو احتیاطاً ہم نے گویائی سکھادی ہے

رضا کارانِ آزادی کے شوقِ تاجپوشی نے
جو کچھ رتبہ بڑھایا ہے تو قیمت بھی گھٹادی ہے

بنامِ دینِ ابراہیمؑ بس اتنا کیا ہم نے
کہ بُت خانے سے مِلتی جُلتی اک مسجد بنالی ہے

یہ سچ ہے بجلیاں بھی بار ہا ٹوٹی ہیں گلشن پر
مگر اس آگ کے شعلوں کو خود ہم نے ہوا دی ہے

سُنا تھا جشن ہوگا اور گھر گھر روشنی ہوگی
نہیں معلوم یہ تقریب کب تک ملتوی ہوگی

یہ بے مقصد سفر اب ختم ہو جاتا تو اچھا تھا
نہ تم سے رہبری ہوگی، نہ ہم سے پیروی ہوگی

دلوں کو نُور بخشو تاکہ گھر گھر روشنی پھیلے
چراغوں سے اگر ہو بھی تو کتنی روشنی ہوگی

طلوعِ صبحِ صادق کی چمک کچھ اور ہوتی ہے
تمھیں دھوکا ہُوا، شاید کہیں بجلی گری ہوگی

مرے جُرمِ وفا کا فیصلہ کچھ اس طرح ہوگا
سزا کا حکم فوری اور سماعت سرسری ہوگی

بجھا لو اپنی آنکھیں جس طرح ہم نے بجھالی ہیں
نہ خوفِ تیرگی ہوگا نہ فکرِ روشنی ہوگی

ہمارے شہر کا احوال سُنئے گا تو ہنسئے گا
کتابوں میں کبھی ایسی کہانی کیا پڑھی ہوگی

یہاں سے جب کوئی سیّاح اپنے گھر گیا ہوگا
ہماری بات اس نے جانے کس کس سے کہی ہوگی

ہمیں دربارِ شاہی میں نہ لے چلتے تو اچھا تھا
ہمارا کچھ نہ جائے گا تمھیں شرمندگی ہوگی

تقاضا وقت کا اقبالؔ کیا ہے میں سمجھتا ہوں
میں اپنے ہونٹ سی تو لوں مگر یہ خودکشی ہوگی

○

وہ یوں مِلا کہ بظاہر خفا خفا سا لگا
وہ دوسروں سے مگر مجھ کو کچھ جُدا سا لگا

مزاج اس نے نہ پوچھا مگر سلام لیا
یہ بے رُخی کا سلیقہ بھی کچھ بھلا سا لگا

وہ جس کی کم سُخنی کو غرور سمجھا گیا
مری نگاہ کو وہ پیکرِ حیا سا لگا

میں اپنے کرب کی رُوداد اس سے کیا کہتا
خود اس کا دل بھی مجھے کچھ دُکھا دُکھا سا لگا

غُبارِ وقت نے کچھ یوں بدل دیے چہرے
خود اپنا شہر بھی مجھ کو نیا نیا سا لگا

گھٹی گھٹی سی لگی رات انجمن کی فضا
چراغ جو بھی جلا کچھ بجھا بجھا سا لگا

جو ہم پہ گزری ہے شاید سبھی پہ گزری ہے
فسانہ جو بھی سنا کچھ سنا سنا سا لگا

میں گھر سے چل کے اکیلا یہاں تک آیا ہوں
جو ہم سفر بھی ملا، کچھ تھکا تھکا سا لگا

کچھ اس خلوص سے اس نے کہا مجھے اقبالؔ
خود اپنا نام بھی مجھ کو بہت بڑا سا لگا

○

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
مری آنکھ کیسے چھلک گئی، مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا

مری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی، ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بُجھا ہوا

مجھے جو بھی دشمنِ جاں ملا، وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا

مجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے یہ خود اپنے دل ہی سے پوچھئے
مری داستانِ حیات کا تو ورق ورق ہے کُھلا ہوا

جو نظر بچا کے گزر گئے مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

مرے ایک گوشۂ فکر میں، میری زندگی سے عزیز تر
مرا ایک ایسا بھی دوست ہے جو کبھی ملا نہ جدا ہوا

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا، کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مِٹا ہوا

مجھے ہم سفر بھی مِلا کوئی تو شکستہ حال مری طرح
کئی منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستے میں لُٹا ہوا

ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے، سرِ راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا، نہ سفر کا حق ہی ادا ہوا

○

چُپ رہتے تو دم گھٹتا اور درد سوا ہوتا
کچھ مُنھ سے نکل جاتا تو کوئی خفا ہوتا

یہ سوچ کے ہم پھر بھی بیٹھے رہے محفل میں
ہم اُٹھ کے چلے آتے تو اور بُرا ہوتا

ترکش میں جو باقی ہے وہ تیر بھی کیوں رکھّا
جو کچھ بھی ارادہ تھا، پُورا تو کیا ہوتا

ہم دل میں جگہ دیتے، سینے سے لگا لیتے
جو تیر تمھارا تھا، وہ کیسے خطا ہوتا

تم ہم پہ جفا کرتے، ہم تم کو دعا دیتے
بے لوث محبّت کا کچھ حق تو ادا ہوتا

آپس کی شکر رنجی کا غیروں سے کیا رشتہ
شکوہ تمھیں کرنا تھا تو ہم سے کیا ہوتا

وہ جب بھی ذرا روٹھا چپ بیٹھے رہے ہم بھی
اک بار منا لیتے تو روز خفا ہوتا

اقبالؔ سے کل تم نے جس لہجے میں باتیں کیں
وہ اُٹھ کے چلا جاتا محفل سے تو کیا ہوتا

آپ کو ہم جلتے ہیں ہم کو مت بہلائیے
وعدہ کرتا ہے تو کر لیجئے قسم مت کھائیے

یہ نہ پوچھیں آپ میرے دل میں کتنے زخم ہیں
اور کتنے تیر ہیں ترکش میں یہ فرمائیے

از رہِ تمہید پرسش کا تکلّف چھوڑئیے
میرے لائق کوئی خدمت ہو تو وہ فرمائیے

آپ کو اصرار ہے ترکِ تعلّق پر تو خیر
آپ کے کچھ خط ہیں میرے پاس، لیتے جائیے

مسکراہٹ روک لی، نظریں جھکا کر بیٹھے
آپ کیسے جانِ محفل ہیں، ذرا شرمائیے

عمر بھر کی داستاں یوں ختم ہونے سے رہی
رات گہری ہو چلی، اب پھر سہی، سو جائیے

اپنا دُکھڑا روئیے اقبالؔ کس کے سامنے
کس کو کس کو اپنے ذاتی مسئلے سمجھائیے

○

وہ نظر سے دُور تو ہیں مگر یہ عجیب صورتِ حال ہے
ہمہ وقت پیشِ نظر بھی ہیں، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

نہ وہ ہم سے کم، نہ ہم اُن سے کم، وہ اُدھر خفا ہم اِدھر خفا
نہ اُنھیں ہمارا خیال ہے نہ ہمیں دماغِ سوال ہے

یہی قربتیں، یہی فاصلے تو خلوصِ عشق کی جان ہیں
کبھی گردِ رنج و ملال ہے، کبھی فکرِ پرسشِ حال ہے

یہ تمھاری تلخ نوائیاں کوئی اور سہہ کے دکھا تو دے
یہ جو مجھ میں تم میں نباہ ہے مرے حوصلے کا کمال ہے

مجھے اس کا کوئی بھی غم نہیں کہ کسی نے مجھ سے وفا نہ کی
میں کسی کے کام نہ آسکا مجھے صرف اس کا ملال ہے

جو گزر رہی ہے گزار دو، نہ بُرا کہو، نہ گلہ کرو
جو تمھارا حال ہے دوستو، وہی سارے شہر کا حال ہے

میں کہاں سے لاؤں وہ روشنی جو کسی کے شہر میں لُٹ گئی
وہ کسی کا شہر بھی لُٹ گیا مجھے اس کا اور ملال ہے

ترے مشورے کے خلوص پر مجھے ترکِ عشق قبول ہے
مگر ایک بات ہے ہم نشیں، مری زندگی کا سوال ہے

اس نے عرضِ مدعا کی مجھ سے فرمائش تو کی
لفظ ہونٹوں تک نہ پہنچے، میں نے کچھ کوشش تو کی

چارہ سازی کی توقّع تو الگ اک بات ہے
یہ بھی کیا کم ہے کہ اس نے زحمتِ پرسش تو کی

میری چشمِ شوق ہی اس کو مخاطب کر سکی
ساری محفل میں نگاہِ ناز نے گردش تو کی

ان کے کہنے میں نہ آیا قلبِ انجام آشنا
ان کی نظروں نے مری نظروں سے کچھ سازش تو کی

یہ بھی سوچا اس چمن کے باغباں ہیں کون لوگ!
آپ نے خونِ جگر سے اس کی آرائش تو کی

حسبِ منشاء میرے شکوے کارگر ثابت ہوئے
کفر تو ٹوٹا، لبوں نے آپ کے جنبش تو کی

وہ تو کہئے سخت جاں تھے ہم حوادث آشنا
گردشِ دوراں نے ورنہ پے بہ پے یورش تو کی

رفتہ رفتہ آ گئے اقبالؔ آدابِ سفر
اوّل اوّل میرے قدموں نے ذرا لغزش تو کی

○

کوچے میں ترے کون سا جادو ہے نہ جانے
جو لَوٹ کے آوے ہے وہ دیوانہ لگے ہے

یاد آویں ہیں جب نیند سے بوجھل تری آنکھیں
غم خانہ بھی جیسے مجھے میخانہ لگے ہے

افسانہ تو سب جانیں ہیں سچّا نہیں ہوتا
اس دَور میں سچ بات بھی افسانہ لگے ہے

چہروں کا عجب حال ہے افکار کے ہاتھوں
اپنا بھی مِلے کوئی تو بیگانہ لگے ہے

مسجد جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے
کعبہ ہی لگے ہے نہ صنم خانہ لگے ہے

درویش نما لوگوں سے بچ بچ کے گزریو
انداز فقط ان کا فقیرانہ لگے ہے

گلشن بھی بہت دیکھے ہیں ان آنکھوں نے اقبالؔ
جن آنکھوں کو اب شہر بھی ویرانہ لگے ہے

چہروں پہ نہ رونق ہے، نہ ہونٹوں پہ تبسّم
اب محفلِ احباب بھی غم خانہ لگے ہے

دوستی اُس سے کوئی کیسے بڑھانا چاہے
ہاتھ تو ہاتھ جو آنکھیں نہ ملانا چاہے

حُسنِ معصوم کی پہچان ہے یہ حُسنِ تضاد
خود مخاطب بھی ہو، آنکھیں بھی چُرانا چاہے

زخم تو ایک تبسم بھی لگا سکتا ہے
سو بہانے ہیں اگر کوئی ستانا چاہے

ہم نے کب زحمتِ پُرسش کی گزارش کی تھی
اُس سے کہئے جو یہ احسان اُٹھانا چاہے

ایسے نادان کو اس دور میں کیا کہتے ہیں
زخم کھا کے جو آنسو بھی چُھپانا چاہے

ہم بھی اب دیں گے جفاؤں سے جفاؤں کا جواب
اب ہمیں کچھ بھی کہے سارا زمانہ چاہے

اس کا اقبالؔ گلستاں میں گزر کیسے ہو
رہ کے کانٹوں میں جو دامن بھی بچانا چاہے

○

چارہ گر کھو گئے، نیند آ گئی غمخواروں کو
اپنی رُوداد سُنائیں کسے؟ دیواروں کو!

ان کو آنا ہی پڑا سوئے حرم کیا کرتے
بتکدے راس نہیں آئے پرستاروں کو

لاکھ ڈالی گئی چہروں پہ تقدّس کی نقاب
لوگ پہچان گئے حاشیہ برداروں کو

آتے آتے ہی انھیں آئیں گے آدابِ قفس
کوئی چھیڑے نہ ابھی تازہ گرفتاروں کو

جَیبِ دانش سے اُلجھ جاتا ہے جب دستِ جنوں
دیکھتا ہے وہ قَباؤں کو نہ دستاروں کو

اب مسیحائی کا آسان طریقہ یہ ہے
زہر دے دیتے ہیں سوتے ہوئے بیماروں کو

جو تھے بازار میں اقبالؔ کبھی جنس گراں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں وہ لوگ خریداروں کو

○

تمھاری اس نوازش کا میں طالب تھا نہ طالب ہوں
تمھیں دھوکا ہوا شاید کہ میں تم سے مخاطب ہوں

تم آزردہ ہوئے مجھ سے مجھے افسوس ہے لیکن
غلط الزام کیسے مان لوں میں حق بجانب ہوں

مجھے کچھ آپ سے کہنا تو تھا، کچھ کیا، بہت کچھ تھا
مگر میں کیا کروں میں قائل حفظِ مراتب ہوں

شبِ غم پھر شبِ غم ہے، اندھیرا اس کی فطرت ہے
شبِ غم سے نہیں، میں شکوہ سنجِ صبحِ کاذب ہوں

نہ رسوائی کا اندیشہ، نہ زحمت لب کشائی کی
جو آنکھیں گفتگو کرتی ہیں میں ان سے مخاطب ہوں

جو مِلنا ہے تو مجھ سے دوستوں کی سطح پر ملئے
نہ درباری ہوں میں کوئی نہ حضرت کا مصاحب ہوں

بس اتنا ہے کہ میں اقبال ہوں اور شعر کہتا ہوں
یہ میں نے کب کہا میں حضرتِ اقبالؔ و غالبؔ ہوں

میرا کیا حال ہے خود اپنی جفا سے پوچھو
اپنے بھولے ہوئے پیمانِ وفا سے پوچھو

حق بجانب ہے کہاں تک مری شکوہ سنجی
اپنی افسردہ و نم چشمِ حیا سے پوچھو

قافلے کیسے لُٹے، کون سی منزل پہ لُٹے
مجھ سے مت پوچھو، کسی راہ نما سے پوچھو

مجھ سے مت پوچھو تقدّس کے عناصر کیا ہیں
جُبّہ و طُرّہ و دستار و قبا سے پوچھو

بامرادوں کو کسی بات کی فرصت ہی کہاں
شکر کہتے ہیں کسے دستِ گدا سے پوچھو

سادہ لوحوں کو جفاؤں کا مزہ کیا معلوم
لذّتِ جرمِ وفا اہلِ وفا سے پوچھو

سجدۂ شکر بہرحال کیا ہے میں نے
میرا شاہد ہے خدا، میرے خدا سے پوچھو

میں نے کیوں خود کو اندھیروں میں چُھپا رکھا ہے
اس ارادے کا سبب میری انا سے پوچھو

خوش خراموں سے نہ پوچھو کبھی منزل کا پتہ
پُوچھنا ہو تو کسی آبلہ پا سے پوچھو

○

نقاب پوشوں کو پہچان لو سرِ محفل
ہم آج ساری نقابیں اُٹھائے دیتے ہیں

یہ لوگ لوٹ بھی سکتے ہیں راستے میں تمھیں
قدم قدم پہ جو آنکھیں بچھائے دیتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں جو شوقِ سرفروشی میں
لہو لہو ہیں مگر مسکرائے دیتے ہیں

یہ کیسے لوگ ہیں، عقلوں کو کیا ہوا ان کی؟
جو روشنی کے لئے گھر جلائے دیتے ہیں

سحر کے دھوکے میں کچھ سادہ لوح تیرہ نصیب
چراغ گھر کے ابھی سے بجھائے دیتے ہیں

یہ کس کے ہاتھ ہیں تم توڑ کیوں نہیں دیتے
جو شہر بھر کی فصیلیں گرائے دیتے ہیں

ہمارے سامنے کل تک جو طفلِ مکتب تھے
خدا کی شان وہ اب ہم کو رائے دیتے ہیں

○

تم ماتھے پہ بل ڈال کے جو بات کرو گے
تو یاد رہے ہم سے بھی ویسی ہی سنو گے

یہ ہم سفری مصلحتِ وقت تھی ورنہ
یہ تو ہمیں معلوم تھا تم ساتھ نہ دو گے

یہ تازہ ستم ہم کو گوارا تو نہیں ہے
ہم یہ بھی سہے لیتے ہیں کیا یاد کرو گے

ہم شوق میں برباد ہوئے اپنے ہی ہاتھوں
رُوداد ہماری جو سنو گے تو ہنسو گے

تم آج سمجھتے ہو ہمیں غیر تو سمجھو
اوروں سے ملو گے تو ہمیں یاد کرو گے

ہم بھی کوئی دریوزہ گروں میں سے نہیں ہیں
تم اپنی جگہ ہو گے بڑے لوگ، تو ہو گے

منزل بھی ابھی دوُر ہے اور راہ بھی دشوار
کیا ہو گا اگر اپنے ہی سائے سے ڈرو گے

اپنوں سے خفا ہو کے کہاں جاؤ گے آخر
اقبالؔ کو کب تک نظر انداز کرو گے

○

ہر چند ان کے حکم کی تعمیل کی گئی
جُرمِ وفا کی پھر بھی سزا ہم کو دی گئی

اک شاہراہِ منزلِ مقصود تو بنی
دیوار ہر قدم پہ مگر کھینچ دی گئی

قاضی ہیں دُبلے شہر کے اندیشے میں مگر
ان سے خود اپنے گھر کی حفاظت نہ کی گئی

سو بار انجمن میں چراغاں کیا گیا
چہروں پہ نور آیا نہ تیرہ شبی گئی

کہنے کو گُل ہوا ہے فقط ایک ہی چراغ
سچ پوچھئے تو بزم کی رونق چلی گئی

اک داستان آنکھوں میں میری جو بند ہے
لکھی گئی کہیں نہ زبانی سُنی گئی

اقبال کہنے والا بڑی بات کہہ گیا
" اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی "

○

کیا تھا ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا کوئی
دو دن جُدا رہا تو نیا ہو گیا کوئی

وہ بھی مجھے عزیز تھا میں بھی اُسے عزیز
پھر جانے کیا ہوا کہ خفا ہو گیا کوئی

میری نظر نے اس کو خد و خال دے دئے
زہرہ جمالِ شہرِ سبا ہو گیا کوئی

محفل میں تھا تو چاند کی صورت صبیح تھا
تنہا ملا تو رنگِ حنا ہو گیا کوئی

اس خوش ادا گریز کے قربان جایئے
مجھ کو سلام کر کے ہوا ہو گیا کوئی

الزام ہم پہ آیا کہ ہم مستعد نہ تھے
جب بھی کسی کا تیر خطا ہوگیا کوئی

مجھ جیسے بے نوا کو نوازا بصد خلوص
یوں بھی بڑا تھا اور بڑا ہوگیا کوئی

○

شمعِ امّید بہر گام جلائے رکھنا
رات گہری ہے ابھی جوت جگائے رکھنا

قافلہ کوچ نہ کر دے کہیں ہشیار رہو
اپنے کاندھوں پہ ابھی بوجھ اُٹھائے رکھنا

رات باقی ہے ابھی صبح کا کچھ ٹھیک نہیں
کچھ ستارے ابھی پلکوں پہ سجائے رکھنا

ایک آنسو کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے
روشنی کم سہی یہ شمع جلائے رکھنا

تم کو ورثے میں مِلا ہے یہ محبت کا عَلم
اس کی تعظیم کرو، اس کو اُٹھائے رکھنا

ان پہ تحریر ہے اک عہدِ وفا کی تاریخ
اپنے ہر زخم کو سینے سے لگائے رکھنا

کیا خبر آہوں کی کس وقت ضرورت پڑ جائے
اپنے یہ فیصلہ کُن تیر چھپائے رکھنا

○

مرا خلوص اگر معتبر نہ ہو نہ سہی
نگاہِ نازِ مخاطب اِدھر نہ ہو نہ سہی

گزر ہی جائے گی یہ زندگی خوش و ناخوش
ہمارے حال کی تم کو خبر نہ ہو نہ سہی

یہ دیکھنا ہے کہ کتنی طویل ہے یہ رات
تمام شمعیں جلا دو، سحر نہ ہو نہ سہی

ہمارے جسم کا سایہ تو ساتھ چلتا ہے
رہِ سفر میں کوئی ہم سفر نہ ہو نہ سہی

دعا کرو کہ رہیں اپنی بستیاں آباد
ہمارا کیا ہے کوئی اپنا گھر نہ ہو نہ سہی

یہ اضطراب کا عالم بھی کچھ بُرا تو نہیں
سکون نصیب ہمیں عمر بھر نہ ہو نہ سہی

مرا سلام اشارے ہی سے قبول کرو
کلام مجھ سے مناسب اگر نہ ہو نہ سہی

○

سب سمجھتے ہیں کہ ہم کس کارواں کے لوگ ہیں
پھر بھی پوچھا جا رہا ہے ہم کہاں کے لوگ ہیں

ملّتِ بیضا نے یہ سیکھا ہے صد ہا سال میں
یہ یہاں کے لوگ ہیں اور وہ وہاں کے لوگ ہیں

ان سے مت پوچھو کہ منزل تم سے کیوں چھینی گئی
ان سے مت اُلجھو، یہ میرِ کارواں کے لوگ ہیں

خالی پیمانے لئے بیٹھے ہیں رندانِ کرام
میکدہ ان کا ہے جو پیرِ مغاں کے لوگ ہیں

گُل فروشی سے انھیں ہم روکنے والے ہیں کون
ہم چمن کے لوگ ہیں وہ باغباں کے لوگ ہیں

سرکشی کی کیا سزا ہے اپنے دل سے پوچھیے
یاد کیجیے، آپ تو باغِ جناں کے لوگ ہیں

اپنے دشمن سے ہمیں اقبالؔ کوئی ڈر نہیں
ان سے بیشک خوف ہے جو درمیاں کے لوگ ہیں

○

خوش خیالی میں نشیمن نہ سجاؤ پہلے
آبرو صحنِ گلستاں کی بچاؤ پہلے

بعد میں جشنِ چراغاں کا تکلّف کرنا
گھر میں جو آگ لگی ہے وہ بجھاؤ پہلے

شکریہ پرسشِ احوال کی زحمت کا مگر
اپنے چہروں سے نقابیں تو اُٹھاؤ پہلے

ہاتھ کیا دل بھی مِلا سکتے ہیں ہم اہلِ وفا
آستینوں میں مگر کیا ہے دکھاؤ پہلے

جرم ناکردہ کا الزام سر آنکھوں پہ مگر
اپنے دامن کے یہ دھبّے تو چھُپاؤ پہلے

تم نے سونپے ہیں جنھیں راہبری کے منصب
ان کو چلنے کا سلیقہ تو سکھاؤ پہلے

فکرِ آتش زدگاں تم جو کرو گے معلوم
اپنی دستار تو شعلوں سے بچاؤ پہلے

○

شہر میں کتنے اکابر ہیں ہمیں کیا معلوم
ہم تو تقدیر پہ شاکر ہیں ہمیں کیا معلوم

یہ تو موصوف بتائیں گے ارادہ کیا ہے
ہم بقول ان کے مہاجر ہیں ہمیں کیا معلوم

ہم تو سمجھے تھے یہاں پائیں گے ہم دادِ سخن
آپ حضرات بھی شاعر ہیں ہمیں کیا معلوم

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ہم شہر میں اخلاص و وفا
اب یہ قدریں بھی نوادر ہیں ہمیں کیا معلوم

ہم کو دھوکا ہوا دستار و قبا سے ان کی
یہ ثقہ لوگ بھی تاجر ہیں ہمیں کیا معلوم

○

پاک دامن کون ہے اور لائقِ تعزیر کون
فیصلہ اس کا کرے گا منصفِ تقصیر کون

کون ہے جو خود نہ ہو آلودۂ تردامنی
حشر میں ہوگا کسی قاتل کا دامن گیر کون

اپنا اپنا تیشہ لے کر اُٹھے ہیں کچھ کوہکن
دیکھنا یہ ہے کہ اب لاتا ہے جوئے شیر کون

جس سفینے کو ڈبو دیں مِل کے اس کے ناخدا
اس سفینے کی بدل دے دفعتاً تقدیر کون

صرف تاریخِ جنوں دے سکتی ہے اس کا جواب
رقص کرتا ہے پہن کر پاؤں میں زنجیر کون

○

حال مشکوک ہے فضاؤں کا
دَور ہے یہ نئی ہواؤں کا

ہم سے پوچھو قصور کس کا ہے
کچھ عباؤں کا کچھ قباؤں کا

ہم نے گُل کر دئے چراغ اپنے
اب تو بدلے گا رُخ ہواؤں کا

ان سے مت پوچھ ان کے گھر کا پتہ
گھر کہاں ہوتا ہے گداؤں کا

میکدے تک نہیں ہیں اب محفوظ
یہ زمانہ ہے پارساؤں کا

آج شائد مناظرہ ہے کہیں
پیشواؤں سے رہنماؤں کا

ہم ہیں مارے ہوئے وفاؤں کے
نام بدنام ہے جفاؤں کا

بجلیاں بھی انہیں میں پلتی ہیں
کیا بھروسہ ہے ان گھٹاؤں کا

○

دل فگاروں کا ذکر مت چھیڑو
غم کے ماروں کا ذکر مت چھیڑو

مُنہ سے کیا جانے کیا نکل جائے
غم گساروں کا ذکر مت چھیڑو

شہریاروں کو ناگوار نہ ہو
بے دیاروں کا ذکر مت چھیڑو

کیوں ستاتے ہو غم نصیبوں کو
اب بہاروں کا ذکر مت چھیڑو

میں مخاطب ہوں موجِ طوفاں سے
اب کناروں کا ذکر مت چھیڑو

اب تو آنسو بھی میرے پاس نہیں
بے سہاروں کا ذکر مت چھیڑو

چند یادیں ہیں جن سے وابستہ
اُن دیاروں کا ذکر مت چھیڑو

کون ہے جس پہ یوں جفا کرتے
ہم نہ ہوتے تو آپ کیا کرتے

اجنبی لوگ اجنبی ماحول
کون سنتا اگر گلہ کرتے

ہم نے بھی ہونٹ سی لئے اپنے
ایسی صورت میں اور کیا کرتے

ناز ہے مجھ کو دوستوں پہ مگر
شرم آتی ہے التجا کرتے

گفتگو نذرِ احتیاط ہوئی
قبل اس کے کہ ابتدا کرتے

اب بھی ہم سیر چشم ہیں اقبالؔ
آنکھ ہوتی تو جانے کیا کرتے

کوئی اپنا مزاج داں نہ مِلا
عمر گزری یہی دعا کرتے

○

حادثوں کا کیا ہے وہ آتے رہے جاتے رہے
زندگی کے شوق اپنی بات منواتے رہے

خود فریبی کہئے اس کو یا ہماری سادگی
ہر غمِ تازہ کی خود توجیہ فرماتے رہے

عاشقی میں عزّتِ سادات تو بیشک گئی
یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم سادات کہلاتے رہے

آپ کی تو اک ادا ٹھہری حجابِ درمیاں
اور کچھ نادان اپنی جان سے جاتے رہے

اس نے رسماً پرسشِ احوال کی زحمت تو کی
رنگ چہرے پر کئی آتے رہے جاتے رہے

○

کون ہے جس کے سبب یہ میکدہ بدنام ہے
ہم سے پوچھو ہم بتا سکتے ہیں کس کا کام ہے

یوں بظاہر تو بہت معصوم صورت ہے مگر
وہ بڑا بہروپیا ہے جس کا ساقی نام ہے

ہم نے بے سمجھے کیا تھا کل جو آغازِ سفر
آج جو کچھ ہے اسی آغاز کا انجام ہے

ہم تو اب صوت و صدا کے شہر میں آباد ہیں
ہم کو اس سے کیا غرض کب صبح ہے، کب شام ہے

آپ جس کو تبصرہ کہتے تھے وہ تنقیص تھی
لہجہ شائستہ سہی، الزام پھر الزام ہے

کون کہتا ہے کہ مخلص دوست اب نایاب ہیں
چند کم ظرفوں کے ہاتھوں دوستی بدنام ہے

اس طرح اکثر غرض مندوں کو مِلتا ہے جواب
میں بہت مصروف ہوں، فرمائیے کچھ کام ہے

فقط اک نظر کے سرور سے ترے رند ایسے بہک گئے
کہ لبوں تک آکے بھرے ہوئے کئی جام رات چھلک گئے

مجھے ضبطِ غم پہ غرور تھا، مرے آنسوؤں نے وفا نہ کی
مرے راز، پرسشِ حال پر مری چشمِ نم سے ٹپک گئے

ترے نقشِ پا سے اگر ملی مجھے راہِ شوق میں روشنی
تو مری جبینِ سجود سے ترے نقشِ پا بھی چمک گئے

یہ کدھر سے موجِ ہوا چلی کہ مزاجِ وقت بدل گیا
یہ اِدھر سے کون گذر گیا کہ فضا میں پھول مہک گئے

مجھے چھوڑ دیں کہ سنبھال لیں مری لاج آپ کے ہاتھ ہے
مجھے اعترافِ شکست ہے، مرے پاؤں راہ میں تھک گئے

یہ سفر کا شوق یہ منزلیں تو فقط نصیب کی بات ہے
جو بھٹک رہے تھے پہونچ گئے جو پہونچ چکے تھے بھٹک گئے

مری بزم حسنِ خیال میں وہی میکدہ ہے بسا ہوا
اِدھر آئی یاد وہ زندگی کہ فضا میں جام کھنک گئے

O

رات اک غزل کے شعر بڑا کام کر گئے
محفل میں چند لوگوں کے چہرے اُتر گئے

سچ بات ہم نے جب بھی کہی بے جھجک کہی
چینِ جبیں کو بھی نظر انداز کر گئے

خوابوں کا اک طلسم ہے اور شب گزیدہ لوگ
تعبیر دینے والے نہ جانے کدھر گئے

فکرِ سحر سے تیرہ نصیبوں کو کیا ملا
آنکھیں کھُلیں تو خواب فضا میں بِکھر گئے

پتھّر جو راستے میں پڑے تھے پڑے رہے
کتنے ہی آنکھوں والے اُدھر سے گزر گئے

جو لوگ نذرِ سیل ہوئے اُن کا غم نہیں
شہروں کے لوگ خوش ہیں کہ دریا اُتر گئے

اقبالؔ اپنے عیب بھی آنے لگے نظر
دشمن ہمارے ہم پہ یہ احسان کر گئے

○

بکھری پڑی ہے شہر میں خوشبو گلی گلی
گزرا ہے جیسے کوئی اِدھر سے ابھی ابھی

اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
ہوتا ہے خود فریبی میں یوں بھی کبھی کبھی

محفل میں دوستوں کی کوئی جا کے کیا کرے
چہرے دُھواں دُھواں ہیں نگاہیں بُجھی بُجھی

کچھ ہو سکونِ قلب مُیسّر تو جانیے
باتیں تو سُنتے آئے ہیں ہم بھی بڑی بڑی

نعرے فلک شگاف ہیں، دعوے بلند بانگ
عنواں جلی جلی ہیں عبارت خفی خفی

نکلے تھے گھر سے جس کے تحفّظ کے واسطے
مٹّی میں مِل گئی وہ شرافت رہی سہی

اقبالؔ ساری عمر گزاری ہے جس طرح
جو رہ گئی ہے کاٹ دو وہ بھی ہنسی خوشی

متفرّق اشعار

اُتر کر قصرِ عالی سے ہمارے روبرو آؤ
بلندی سے ہمارے قد کا اندازہ نہیں ہوگا

پستہ قد لوگوں ہی سے ملتے ہیں حضور والا
ان کا قد تا کہ نمایاں نظر آئے سب کو

آپ کے لہجے میں پندار کی بُو آتی ہے
سرپرستوں کی طرح حال نہ پوچھا کیجے

سنگ دل ہاتھ سے یوں شیشۂ نازک کو نہ توڑ
شیشہ ٹوٹے گا تو یہ ہاتھ بھی زخمی ہوگا

فلسفہ نام ہے اُلجھی ہوئی تاویلوں کا
جو مسائل کو معمّوں میں بدل دیتی ہیں

تمہارا شہر تو آباد ہو گیا لیکن
تمہارے شہر کی خاطر ہم اپنے گھر سے گئے

اندازِ التفات بھی اب معتبر نہیں
ان کی نظر اِدھر ہے، توجہ اِدھر نہیں

خطائیں کرکے میں ویسے بھی کم ملول نہ تھا
قبولِ توبہ سے کچھ اور شرمسار ہوا

دل کی قیمت کا تعین گو بہت دشوار ہے
پیار سے دیکھے کوئی تو دل کی قیمت اک نظر

آنکھ تو بے شک ذرا نم ہو گئی
درد کی شدّت مگر کم ہو گئی

ہر دَور میں جشنِ رسن و دار ہوا ہے
اور جب بھی ہوا ہے سرِ بازار ہوا ہے

تم خفا ہم سے اور ہم تم سے
اس کو کہتے ہیں اتّفاق کی بات

تیز قدموں سے چلو اور تصادم سے بچو
بھیڑ میں سُست چلوگے تو کچل جاؤ گے

تم فقط میکدوں کو کہتے ہو
جھانک کر دیکھو خانقاہوں میں

کچھ سمجھ کر ہی کیا تھا اس نے شہروں سے فرار
ہم ہی دیوانے نہیں شاید، قیس سودائی نہ تھا

میرے آنسو بھی بے اثر نکلے
اک سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر
رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

صبح کی پہلی کرن لائے گی پیغامِ حیات
اسی زنداں میں ہے اک روزنِ زنداں اب بھی

آئینہ سچ بولتا ہے، بے جھجک اور روبرو
ہو نہ چہرے پر اگر کوئی ملمع یا نقاب

تم اہلِ قلم کی فکر کرو، ہم اہلِ زباں سے مت اُلجھو
ہم لکھتے نہیں ہم کہتے ہیں تم ہم سے قلم کیا چھینو گے

قطعات

جو تیرہ بخت اُجالوں سے خوف کھاتے ہیں
وہ کانپ جاتے ہیں جب بھی کہیں چراغ جلے
وہ جانتے ہیں کہ ظلمت ہے مُجرموں کی رفیق
جو اُن کا زور چلے تو کبھی نہ رات ڈھلے

شام کو جب چراغ جلتے ہیں
سائے قدموں کے ساتھ چلتے ہیں
یہ کہیں اور سے نہیں آتے
سائے خود روشنی میں پلتے ہیں

ایک پروانہ جو جل بُجھتا ہے نادانستہ
لوگ کہتے ہیں کہ وہ شمع کا پروانہ ہے
عشق کچھ کھیل نہیں ہے جو پتنگے کھیلیں
فقط کہنے کی اک بات ہے افسانہ ہے
